

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222814

UNIVERSAL
LIBRARY

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس

(انجمن ترقی تعلیم رآباد دکن)
کے

گیارہویں سالانہ جلسہ کی

روڈ آد

— (جو) —

بلن فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں

بتواریخ ۲۱ و ۳۱ مہر ۱۳۴۷ء فصلی

بمستام ٹاون ہال بلن عامہ منعت رہوا

CHECKED. 1951

۲۲۰ م



۸۹۱۵ ۲۳۰۶

Checked 1969.

۱ - ۹

فہرست مضامین

۱۳۵۱

1952

تبصرہ

- ۸۰ تحریک ہنرا (لڑکیوں کی تعلیم)
- ۸۰ تحریک نمبر ۱۱ (مدرسہ سنواں نام ملی میں)
- ۸۳ مقالہ ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب {
ادبیات جدید ایران
- ۹۰ تحریک نمبر ۱۲ (مدارس کے لئے وسیع {
مکانات کی ضرورت)
- ۹۲ تقریر ڈاکٹر سید حسین صاحب {
”حیف آباد میں صنعتی ترقی کے امکانات“
- ۹۶ تحریک نمبر ۱۲ (اصطلاح میں کتب خاںوں کا قیام)
- ۹۶ مقالہ ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی {
”سائنس کی تعلیم“
- ۱۰۶ تقریر نواب مہدی یار جنگ بہادر
- ۱۰۶ تحریک نمبر ۱۳ (سابقہ تحریکات پر {
توجہ دہانی
- ۱۰۸ ضمیمہ اول فہرست ارکان {
مجلس انتظامی
- ۱۰۹ ضمیمہ دوم تحریکات کا تفہیم جو {
سرکار عالی نے منظور فرمائے
- ۱۱۱ مختصر کیفیت سب کمیٹی پر مبنی
- ۱۱۱ ضمیمہ سوم یادداشت متعلق {
وظائف کانفرنس
- ۱۱۶ ضمیمہ چہارم گوشوارہ حیات
- ۱۲۱ ضمیمہ پنجم، فہرست ارکان کانفرنس

CHECKED 1956

- ۱ اجلاس اول
- ۳ خطبہ صدارت استقبالی
- ۵ خطبہ صدارت
- ۲۲ روڈاد سکرٹری
- اجلاس دوم
- ۳۳ تحریک ہنرا (تعلیم و بنیات)
- ۳۵ تقریر مولوی محمد فاروق صاحب {
مجالس مقامی اور تعلیم
- ۴۲ تحریک نمبر ۲ (زر اعظمی کلچر)
- ۴۵ مقالہ ڈاکٹر میرولی الدین صاحب {
”خیالات کا اثر قیمت پر“
- ۵۰ تحریک نمبر ۳ (صنعتی تعلیم)
- ۵۳ تحریک نمبر (سینا میں طلبہ کا داخلہ)
- اجلاس سوم
- ۵۶ تحریک نمبر ۵ (تعلیم خوش نویسی)
- ۵۹ تحریک نمبر ۶ (جڑی بوٹیوں سے استفادہ)
- ۶۱ تحریک نمبر (درسی کتب وغیرہ کی ارزانی)
- ۶۲ مقالہ راجہ بہادر رائے بشیشو ناظمہ صاحب {
قانون کی تعلیم کے لئے موجودہ طریقہ تعلیم
- تقریر نواب مرزا یار جنگ بہادر {
”ترک مسکرات“
- ۶۹ تحریک نمبر (طلبہ میں کفایت کی عادت)
- ۷۵ اجلاس چہارم
- ۷۷ تحریک نمبر ۹ (زنانی مدارس میں ہوا ریسٹورانٹ نظام)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تبصرہ

حیدرآباد ایجوکیشن کانسفرنس کے گیارہویں اجلاس کی روئداد مغرزار اکین کانسفرنس اور بہی خوانان ملک و ملت کے ملاحظہ کے لئے شائع کیجاتی ہے۔

کانسفرنس کا نام اور کام ملک پر تقریباً (۲۶) سال سے روشن ہے۔ اس کے اجلاس حیدرآباد میں (۷) مرتبہ اور اورنگ آباد لاٹور پرنسپی میں ایک ایک وقت منعقد ہو چکے ہیں۔ اس کی صرف تین ابتدائی جلسوں کی روئدادیں شائع ہوئیں اس کے بعد کی روئدادیں مختلف اسباب سے شائع نہ ہوئی ہیں امید ہے کہ یہ روئداد کانسفرنس کے خدمات کی یاد تازہ کریگی اور ملک کی نوجوان نسل کو اس سے واقفیت کا موقع ملے گا۔ پہلا اجلاس منعقد ہو کر اب (۲۵) سال گزر چکے ہیں اور عملاً اسکی (۲۵) سالہ سلور جوبلی گویا مجوزہ اجلاس میں منعقد ہوگی۔

قومی و ملکی تحریکات کی عمر نہایت طویل ہوا کرتی ہے جبکہ حیدرآباد ایجوکیشن کانسفرنس کا مقصد بالخاصہ مذہب و ملت زیر سایہ تخت آصفی ملک کی بے لوث خدمت گزاری ہے امید ہے کہ نئی نسل اس کانسفرنس کو خدمت ملک کا محور بنائے گی تاکہ اس نازک دور عبوری میں بے راہ روی نہ ہونے پائے۔

اجلاس اول

بتاریخ ۱۲ مہر سہ ماہ ف مطابق ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ م ۱۸ اگست ۱۹۳۸ء روز پنجشنبہ دس بجے صبح ٹاون ہال باغ عامہ میں پہلا اجلاس شروع ہوا۔

ہر چند نو سال کے طویل عرصہ کے بعد کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا لیکن وقت مقررہ پر یہ ثابت ہو گیا کہ کانفرنس پر آج بھی بدستور سابق عامۃ الناس کا پورا اعتماد قائم ہے اور اس کے غیر فرقہ واریت فلام پر بلا امتیاز مذہب ملت ملک کے اکابر اور اہل الرائے جوش اور خوش دلی سے جمع ہیں۔

ٹاون ہال کی ساری گنجائش کانفرنس کے ہمدردوں سے معمور اور ہر طرف ایک خاص چلن چلن نمایاں تھی۔ وقت مقررہ پر جناب نواب ڈاکٹر ناظر یار جنگ بہادر ام۔ اے۔ ال ال ڈی بیرسٹرائٹ لاجسٹیکس صدر مجلس استقبالی کرنی صدارت پر تشریف لائے اور کارروائی کا آغاز ہوا اور تین کم سن طلبہ محمد علی شکر راؤ، احمد علی نے مندرجہ ذیل حمد سے اجلاس کا آغاز کیا۔

حمد و ثنا ہو تیری کون و مکان والے اے رب ہر دو عالم دو نوجہان والے

بن مانگے دینے والے عرش و قرآن والے گرتے ہیں تیرے در پر سب ان بان والے

بیشک رحیم ہے تو رحمت نشان والے

یوم الجہاد کے مالک خالق ہمارا تو ہے سجدے ہیں تجھ کو کرتے تیری ہی جستجو ہے

امداد و نجات سے جا میں سب کا سہارا تو ہے تیری ہی بارگاہ میں یہ بھی اک آرزو ہے

رستہ دکھا دے سیدنا او آسمان والے

مقبول یہ دعا ہو اے لامکان والے

حمد خوانی کے اختتام پر جناب ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر نے بحیثیت صدر مجلس استقبالی ایک مختصر تقریر کی

اور بیان کیا کہ

خواتین و حضرات !

حیدرآباد ایجوکیشن کانفرنس کا یہ اجلاس ایک طویل وقفہ کے بعد منعقد ہو رہا ہے۔ یہ وقفہ کئی ناگزیر اسباب کی بنا پر وقوع میں آیا۔ اس موقع پر نہ تو مناسب ہے اور نہ موزوں کہ ان اسباب کی تفصیل کجائے۔ البتہ میں یہ واضح کرنا مناسب خیال کرتا ہوں کہ کانفرنس تقریباً چوتھائی صدی سے ملک کی تعلیمی خدمت گزاری میں مصروف ہے، اس دوران میں اس نے جو خدمات انجام دئے ان میں یہ خدمت بھی شامل ہے کہ اس نے ۷۶ ہزار روپے بطور وظائف و امداد تعلیمی طلبہ میں تقسیم کئے۔ شوقین اور قابل امداد طلبہ کی ہر طرح اعانت کی گئی اور ان کے شوق کو برقرار رکھنے کے لئے جو کچھ کیا جاسکتا تھا ادا سکول میں لایا گیا۔ اس تائید و اعانت اور کانفرنس کی خاموش کوششوں کے بہتر نتائج آج خود ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ طلبہ جنہوں نے محنت و شوق سے تعلیم حاصل کی بعد تکمیل تعلیم آج ملک کے مختلف مقامات میں مصروف عمل ہیں، اور ملک کی خدمت گزاری میں اپنی ممکنہ کوششیں عمل میں لارہے ہیں۔ کانفرنس کی اور دوسری خدمات کو قطع نظر بھی کر دیا جائے تو اس کی صرف یہی خدمت کیا کم سے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کئی طلبہ ایسے تھے کہ اگر ان کی دستگیری عمل میں نہ آتی تو وہ آج اعلیٰ تعلیم کی برکتوں سے محروم رہ جاتے۔

خانگی کوششوں کے ذریعہ سے ملک کی خدمت کرنے کے سلسلہ میں ہماری اس کانفرنس نے ملک میں پہلی مثال قائم کی، کانفرنس کی کوششیں وہی اور اسکے نتائج نے ثابت کر دیا کہ براہ راست یا بالواسطہ طور سے سرکاری امداد حاصل کئے بغیر ملک میں خدمت کر سیکے کیا کچھ مواقع حاصل ہیں۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ تعلیمی ترقی کے لئے پبلک کی ہی کوشش زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انگلستان کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ وہاں ہر قسم کی تعلیم چاہے وہ تھانی ہو یا ثانوی یا یونیورسٹی کی کلائیہ نہیں تو تین چوتھائی صد تک خانگی اور عامۃ الناس کی کوششوں پر منحصر ہے۔ وہاں کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں نے گورنمنٹ کی امداد لینے سے چند سال قبل تک قطعی انکار کر دیا تھا۔

ان حالات میں ہمارے ملک کی پبلک کو بھی چاہئے کہ تعلیمی ترقی کے وسائل اپنے ہاتھ میں لیکر بہم کوششیں عمل میں لائے۔ خانگی درسگاہوں میں ایک بہت سبق آموز تجربہ یہ ہوا ہے کہ وہاں کے اساتذہ اس احساس کے ساتھ تعلیم دیتے ہیں کہ ان کو کسی بیرونی اعزاز کی ضرورت نہیں ہے۔

ان کو اس امر کا خیال بھی نہیں گزرتا کہ آیا ان کو ترقی ملے گی یا نہیں، آیا ان کو مزید گریڈ ملیں گے یا نہیں وہ خود داری اور ایثار کے ساتھ درس و تدریس کے حقیقی مہم کو سمجھ کر اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ وہ تنخواہ کی خاطر

پڑھا رہے ہیں یا یہ کہ ان کو ترقی اور گریڈ کی ضرورت ہے۔ درس تدریس اور طلبہ کی تربیت کا کام ملک کی خدمت سمجھ کر بلا معاوضہ یا بہت کم معاوضہ پر بھی انجام دیا جاسکتا ہے۔

جب میں انگلستان میں تھا تو وہاں یہ دیکھ کر تعجب کرتا تھا کہ کیمبرج اور آکسفورڈ میں مقیم اسناد کے مجلسوں کے وقت بڑے بڑے وزرا اور وزیر اعظم آتے تو وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کا درجہ یونیورسٹی کے بزرگوں اور اساتذہ کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

بہر حال ہماری یہ کانفرنس خود پبلک کی کانفرنس ہے اس کانفرنس کے ذریعہ سے پبلک کو کام کرنے کے بڑے مواقع حاصل ہیں۔ ان مواقع کو اس طور سے کام میں لانا چاہیے کہ عامۃ الناس میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ خود تعلیمی وسائل کو وجود میں لائیں اور ان کو قوت و استقلال سے چلائیں۔ ہمیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ طلبہ اور اساتذہ میں صحیح طور پر جذبہ محبت پیدا ہو جائے

حضرات! ان دنوں تعلیم کے نظام کو جدید قالب میں ڈھانے کے لئے ہر حکمران نئی کوششیں کر رہا ہے۔ وار دھا اسکیم کا نام ہوا اس گونج رہا ہے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے زمانہ میں طلبہ کو کسی صنعت میں ماہر کر دینے کا خیال روز بروز قوت حاصل کرتا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی اس قسم کی اسکیم مرتب ہو چکی ہے، مجھے اس کی اہمیت یا ضرورت سے کوئی انکار نہیں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں میں موجود تعلیمی نظام کی وجہ سے جو سیریزنگری پیدا ہو رہی ہے وہ بہت قابل تشویش ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کوشش میں کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان خود اپنے ہاتھ سے روزی کمانے کے قابل بن جائیں تعلیم کے کچھل پھل کو بالکل نظر انداز نہ کر دینا چاہئے۔

وار دھا اسکیم کے مجوزین نے اولاً صنعت و حرفت کی تعلیم کے لئے اتنا زیادہ وقت کو رس میں رکھا تھا اور ان کے پیش نظر یہ خیال تھا کہ اس اسکیم کو (Self paying) بنایا جاسکے۔ لیکن پھر غرور و غرض کے بعد اس خیال کو ترک کرنا پڑا ہے۔ بہر حال میرا مشاہدہ ہے کہ صنعتی و حرفتی تعلیم میں کسی طور پر بلانڈ قوم کے اصلی مفاد کا باعث نہیں ہو سکتا ہے۔

ایک اور اہم ترین مسئلہ تعلیم سے قوم میں بہترین تاثرات پیدا کرنے کا ہے۔ یہ مقصد بلا کسی نصب العین کے معین کئے قطعاً حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ ہماری حیدر آبادی تعلیم ایسی ہو کہ جس سے ہمارا ملک دنیا کے اعلیٰ ترین ترقی یافتہ ممالک کے صف اول میں شمار ہو سکے۔ موجودہ حالت میں کسی نصب العین کے معین نہ ہونے کی وجہ سے ہم ہر چیز میں دوسروں کے دست نگر رہتے ہیں، یہ حالت اس وقت تک بدل نہیں سکتی جب تک کہ

ہماری تعلیم مستقل اور آزاد مضب العین کے تحت نہ دی جائے۔

اس تقریر کے اختتام کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جناب مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب و ذلیفہ یاب صد کلہ جامعہ عثمانیہ کے کرسی صدارت پر تشریف لانے کی تحریک فرمائی جسے جناب ممدوح کرسی صدارت پر تشریف لاکر اپنا پرترہ اور قیمتی خیالات سے مملو خطبہ صدارت پڑھا وہ حسب ذیل ہے۔

خطبہ صدارت

تمہید

مغز خواہن و حضرات۔

کوئی آٹھ سال قبل اسی ٹاؤن ہال میں حیدرآباد ریجنل کونفرنس کا سوال اجلاس عام منعقد ہوا تھا اور خوش قسمتی سے اس کی صدارت کی عزت مجھ ہی کو نصیب ہوئی تھی۔ اُس کے خطبہ صدارت میں میں نے ملک کے اہم تعلیمی مسائل پر تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کئے تھے اور بتایا تھا کہ ہمارے لئے اس وقت تعلیم کے کن شعبوں پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے اور علی الخصوص ہمارے ملک میں ابتدائی و اعلیٰ تعلیم بمقابل ہندوستان کے دیگر حصوں کے کس رفتار سے ترقی کر رہے ہیں۔ ٹیکنیکل تعلیم کا بھی مجملہ ذکر کیا گیا تھا اور اس زمانہ کے حالات کے منظر چند تعمیری تجاویز پیش کئے گئے تھے۔ الحمد للہ اس مدت میں تعلیم کے جلد شعبے سرعت کے ساتھ ترقی کر گئے اور موجودہ حالت کافی اطمینان کے قابل ہے۔

کانفرنس نے اگرچہ اپنے دسویں اجلاس عام کے بعد کوئی غائبان کام نہیں کئے تاہم اس کے تعلیمی وظائف مثلاً سابق جاری رہے اور نادار طلبہ کو ان سے بہت مدد ملتی رہی۔ اگر کانفرنس کے پہلے اجلاس عام سے جو رائٹ آفیسر سر اکبر حیدری (نواب حیدر نواز جنگ بہادر) کی زبردست صدارت میں منعقد ہوا تھا اب تک کے جاری کردہ وظائف کا حساب لگایا جائے تو اس کی میزان چہتر ہزار روپیہ سے متجاوز ہو جاتی ہے اور ملک کے ہونہار طلبہ کی ایک کثیر تعداد کو اس امداد سے استفادہ کر کے بھی خدمات حاصل کر نیکا موقعہ ملتا آیا۔

اگرچہ میرا تعلق اس کانفرنس کے ساتھ بحیثیت رکن مجالس انتظامی و منجہ وظائف وغیرہ قیام کانفرنس ہی سے چلا آ رہا ہے۔ لیکن ۱۲؎ ۱۳؎ ۱۴؎ ۱۵؎ ۱۶؎ ۱۷؎ ۱۸؎ ۱۹؎ ۲۰؎ ۲۱؎ ۲۲؎ ۲۳؎ ۲۴؎ ۲۵؎ ۲۶؎ ۲۷؎ ۲۸؎ ۲۹؎ ۳۰؎ ۳۱؎ ۳۲؎ ۳۳؎ ۳۴؎ ۳۵؎ ۳۶؎ ۳۷؎ ۳۸؎ ۳۹؎ ۴۰؎ ۴۱؎ ۴۲؎ ۴۳؎ ۴۴؎ ۴۵؎ ۴۶؎ ۴۷؎ ۴۸؎ ۴۹؎ ۵۰؎ ۵۱؎ ۵۲؎ ۵۳؎ ۵۴؎ ۵۵؎ ۵۶؎ ۵۷؎ ۵۸؎ ۵۹؎ ۶۰؎ ۶۱؎ ۶۲؎ ۶۳؎ ۶۴؎ ۶۵؎ ۶۶؎ ۶۷؎ ۶۸؎ ۶۹؎ ۷۰؎ ۷۱؎ ۷۲؎ ۷۳؎ ۷۴؎ ۷۵؎ ۷۶؎ ۷۷؎ ۷۸؎ ۷۹؎ ۸۰؎ ۸۱؎ ۸۲؎ ۸۳؎ ۸۴؎ ۸۵؎ ۸۶؎ ۸۷؎ ۸۸؎ ۸۹؎ ۹۰؎ ۹۱؎ ۹۲؎ ۹۳؎ ۹۴؎ ۹۵؎ ۹۶؎ ۹۷؎ ۹۸؎ ۹۹؎ ۱۰۰؎ ۱۰۱؎ ۱۰۲؎ ۱۰۳؎ ۱۰۴؎ ۱۰۵؎ ۱۰۶؎ ۱۰۷؎ ۱۰۸؎ ۱۰۹؎ ۱۱۰؎ ۱۱۱؎ ۱۱۲؎ ۱۱۳؎ ۱۱۴؎ ۱۱۵؎ ۱۱۶؎ ۱۱۷؎ ۱۱۸؎ ۱۱۹؎ ۱۲۰؎ ۱۲۱؎ ۱۲۲؎ ۱۲۳؎ ۱۲۴؎ ۱۲۵؎ ۱۲۶؎ ۱۲۷؎ ۱۲۸؎ ۱۲۹؎ ۱۳۰؎ ۱۳۱؎ ۱۳۲؎ ۱۳۳؎ ۱۳۴؎ ۱۳۵؎ ۱۳۶؎ ۱۳۷؎ ۱۳۸؎ ۱۳۹؎ ۱۴۰؎ ۱۴۱؎ ۱۴۲؎ ۱۴۳؎ ۱۴۴؎ ۱۴۵؎ ۱۴۶؎ ۱۴۷؎ ۱۴۸؎ ۱۴۹؎ ۱۵۰؎ ۱۵۱؎ ۱۵۲؎ ۱۵۳؎ ۱۵۴؎ ۱۵۵؎ ۱۵۶؎ ۱۵۷؎ ۱۵۸؎ ۱۵۹؎ ۱۶۰؎ ۱۶۱؎ ۱۶۲؎ ۱۶۳؎ ۱۶۴؎ ۱۶۵؎ ۱۶۶؎ ۱۶۷؎ ۱۶۸؎ ۱۶۹؎ ۱۷۰؎ ۱۷۱؎ ۱۷۲؎ ۱۷۳؎ ۱۷۴؎ ۱۷۵؎ ۱۷۶؎ ۱۷۷؎ ۱۷۸؎ ۱۷۹؎ ۱۸۰؎ ۱۸۱؎ ۱۸۲؎ ۱۸۳؎ ۱۸۴؎ ۱۸۵؎ ۱۸۶؎ ۱۸۷؎ ۱۸۸؎ ۱۸۹؎ ۱۹۰؎ ۱۹۱؎ ۱۹۲؎ ۱۹۳؎ ۱۹۴؎ ۱۹۵؎ ۱۹۶؎ ۱۹۷؎ ۱۹۸؎ ۱۹۹؎ ۲۰۰؎ ۲۰۱؎ ۲۰۲؎ ۲۰۳؎ ۲۰۴؎ ۲۰۵؎ ۲۰۶؎ ۲۰۷؎ ۲۰۸؎ ۲۰۹؎ ۲۱۰؎ ۲۱۱؎ ۲۱۲؎ ۲۱۳؎ ۲۱۴؎ ۲۱۵؎ ۲۱۶؎ ۲۱۷؎ ۲۱۸؎ ۲۱۹؎ ۲۲۰؎ ۲۲۱؎ ۲۲۲؎ ۲۲۳؎ ۲۲۴؎ ۲۲۵؎ ۲۲۶؎ ۲۲۷؎ ۲۲۸؎ ۲۲۹؎ ۲۳۰؎ ۲۳۱؎ ۲۳۲؎ ۲۳۳؎ ۲۳۴؎ ۲۳۵؎ ۲۳۶؎ ۲۳۷؎ ۲۳۸؎ ۲۳۹؎ ۲۴۰؎ ۲۴۱؎ ۲۴۲؎ ۲۴۳؎ ۲۴۴؎ ۲۴۵؎ ۲۴۶؎ ۲۴۷؎ ۲۴۸؎ ۲۴۹؎ ۲۵۰؎ ۲۵۱؎ ۲۵۲؎ ۲۵۳؎ ۲۵۴؎ ۲۵۵؎ ۲۵۶؎ ۲۵۷؎ ۲۵۸؎ ۲۵۹؎ ۲۶۰؎ ۲۶۱؎ ۲۶۲؎ ۲۶۳؎ ۲۶۴؎ ۲۶۵؎ ۲۶۶؎ ۲۶۷؎ ۲۶۸؎ ۲۶۹؎ ۲۷۰؎ ۲۷۱؎ ۲۷۲؎ ۲۷۳؎ ۲۷۴؎ ۲۷۵؎ ۲۷۶؎ ۲۷۷؎ ۲۷۸؎ ۲۷۹؎ ۲۸۰؎ ۲۸۱؎ ۲۸۲؎ ۲۸۳؎ ۲۸۴؎ ۲۸۵؎ ۲۸۶؎ ۲۸۷؎ ۲۸۸؎ ۲۸۹؎ ۲۹۰؎ ۲۹۱؎ ۲۹۲؎ ۲۹۳؎ ۲۹۴؎ ۲۹۵؎ ۲۹۶؎ ۲۹۷؎ ۲۹۸؎ ۲۹۹؎ ۳۰۰؎ ۳۰۱؎ ۳۰۲؎ ۳۰۳؎ ۳۰۴؎ ۳۰۵؎ ۳۰۶؎ ۳۰۷؎ ۳۰۸؎ ۳۰۹؎ ۳۱۰؎ ۳۱۱؎ ۳۱۲؎ ۳۱۳؎ ۳۱۴؎ ۳۱۵؎ ۳۱۶؎ ۳۱۷؎ ۳۱۸؎ ۳۱۹؎ ۳۲۰؎ ۳۲۱؎ ۳۲۲؎ ۳۲۳؎ ۳۲۴؎ ۳۲۵؎ ۳۲۶؎ ۳۲۷؎ ۳۲۸؎ ۳۲۹؎ ۳۳۰؎ ۳۳۱؎ ۳۳۲؎ ۳۳۳؎ ۳۳۴؎ ۳۳۵؎ ۳۳۶؎ ۳۳۷؎ ۳۳۸؎ ۳۳۹؎ ۳۴۰؎ ۳۴۱؎ ۳۴۲؎ ۳۴۳؎ ۳۴۴؎ ۳۴۵؎ ۳۴۶؎ ۳۴۷؎ ۳۴۸؎ ۳۴۹؎ ۳۵۰؎ ۳۵۱؎ ۳۵۲؎ ۳۵۳؎ ۳۵۴؎ ۳۵۵؎ ۳۵۶؎ ۳۵۷؎ ۳۵۸؎ ۳۵۹؎ ۳۶۰؎ ۳۶۱؎ ۳۶۲؎ ۳۶۳؎ ۳۶۴؎ ۳۶۵؎ ۳۶۶؎ ۳۶۷؎ ۳۶۸؎ ۳۶۹؎ ۳۷۰؎ ۳۷۱؎ ۳۷۲؎ ۳۷۳؎ ۳۷۴؎ ۳۷۵؎ ۳۷۶؎ ۳۷۷؎ ۳۷۸؎ ۳۷۹؎ ۳۸۰؎ ۳۸۱؎ ۳۸۲؎ ۳۸۳؎ ۳۸۴؎ ۳۸۵؎ ۳۸۶؎ ۳۸۷؎ ۳۸۸؎ ۳۸۹؎ ۳۹۰؎ ۳۹۱؎ ۳۹۲؎ ۳۹۳؎ ۳۹۴؎ ۳۹۵؎ ۳۹۶؎ ۳۹۷؎ ۳۹۸؎ ۳۹۹؎ ۴۰۰؎ ۴۰۱؎ ۴۰۲؎ ۴۰۳؎ ۴۰۴؎ ۴۰۵؎ ۴۰۶؎ ۴۰۷؎ ۴۰۸؎ ۴۰۹؎ ۴۱۰؎ ۴۱۱؎ ۴۱۲؎ ۴۱۳؎ ۴۱۴؎ ۴۱۵؎ ۴۱۶؎ ۴۱۷؎ ۴۱۸؎ ۴۱۹؎ ۴۲۰؎ ۴۲۱؎ ۴۲۲؎ ۴۲۳؎ ۴۲۴؎ ۴۲۵؎ ۴۲۶؎ ۴۲۷؎ ۴۲۸؎ ۴۲۹؎ ۴۳۰؎ ۴۳۱؎ ۴۳۲؎ ۴۳۳؎ ۴۳۴؎ ۴۳۵؎ ۴۳۶؎ ۴۳۷؎ ۴۳۸؎ ۴۳۹؎ ۴۴۰؎ ۴۴۱؎ ۴۴۲؎ ۴۴۳؎ ۴۴۴؎ ۴۴۵؎ ۴۴۶؎ ۴۴۷؎ ۴۴۸؎ ۴۴۹؎ ۴۵۰؎ ۴۵۱؎ ۴۵۲؎ ۴۵۳؎ ۴۵۴؎ ۴۵۵؎ ۴۵۶؎ ۴۵۷؎ ۴۵۸؎ ۴۵۹؎ ۴۶۰؎ ۴۶۱؎ ۴۶۲؎ ۴۶۳؎ ۴۶۴؎ ۴۶۵؎ ۴۶۶؎ ۴۶۷؎ ۴۶۸؎ ۴۶۹؎ ۴۷۰؎ ۴۷۱؎ ۴۷۲؎ ۴۷۳؎ ۴۷۴؎ ۴۷۵؎ ۴۷۶؎ ۴۷۷؎ ۴۷۸؎ ۴۷۹؎ ۴۸۰؎ ۴۸۱؎ ۴۸۲؎ ۴۸۳؎ ۴۸۴؎ ۴۸۵؎ ۴۸۶؎ ۴۸۷؎ ۴۸۸؎ ۴۸۹؎ ۴۹۰؎ ۴۹۱؎ ۴۹۲؎ ۴۹۳؎ ۴۹۴؎ ۴۹۵؎ ۴۹۶؎ ۴۹۷؎ ۴۹۸؎ ۴۹۹؎ ۵۰۰؎ ۵۰۱؎ ۵۰۲؎ ۵۰۳؎ ۵۰۴؎ ۵۰۵؎ ۵۰۶؎ ۵۰۷؎ ۵۰۸؎ ۵۰۹؎ ۵۱۰؎ ۵۱۱؎ ۵۱۲؎ ۵۱۳؎ ۵۱۴؎ ۵۱۵؎ ۵۱۶؎ ۵۱۷؎ ۵۱۸؎ ۵۱۹؎ ۵۲۰؎ ۵۲۱؎ ۵۲۲؎ ۵۲۳؎ ۵۲۴؎ ۵۲۵؎ ۵۲۶؎ ۵۲۷؎ ۵۲۸؎ ۵۲۹؎ ۵۳۰؎ ۵۳۱؎ ۵۳۲؎ ۵۳۳؎ ۵۳۴؎ ۵۳۵؎ ۵۳۶؎ ۵۳۷؎ ۵۳۸؎ ۵۳۹؎ ۵۴۰؎ ۵۴۱؎ ۵۴۲؎ ۵۴۳؎ ۵۴۴؎ ۵۴۵؎ ۵۴۶؎ ۵۴۷؎ ۵۴۸؎ ۵۴۹؎ ۵۵۰؎ ۵۵۱؎ ۵۵۲؎ ۵۵۳؎ ۵۵۴؎ ۵۵۵؎ ۵۵۶؎ ۵۵۷؎ ۵۵۸؎ ۵۵۹؎ ۵۶۰؎ ۵۶۱؎ ۵۶۲؎ ۵۶۳؎ ۵۶۴؎ ۵۶۵؎ ۵۶۶؎ ۵۶۷؎ ۵۶۸؎ ۵۶۹؎ ۵۷۰؎ ۵۷۱؎ ۵۷۲؎ ۵۷۳؎ ۵۷۴؎ ۵۷۵؎ ۵۷۶؎ ۵۷۷؎ ۵۷۸؎ ۵۷۹؎ ۵۸۰؎ ۵۸۱؎ ۵۸۲؎ ۵۸۳؎ ۵۸۴؎ ۵۸۵؎ ۵۸۶؎ ۵۸۷؎ ۵۸۸؎ ۵۸۹؎ ۵۹۰؎ ۵۹۱؎ ۵۹۲؎ ۵۹۳؎ ۵۹۴؎ ۵۹۵؎ ۵۹۶؎ ۵۹۷؎ ۵۹۸؎ ۵۹۹؎ ۶۰۰؎ ۶۰۱؎ ۶۰۲؎ ۶۰۳؎ ۶۰۴؎ ۶۰۵؎ ۶۰۶؎ ۶۰۷؎ ۶۰۸؎ ۶۰۹؎ ۶۱۰؎ ۶۱۱؎ ۶۱۲؎ ۶۱۳؎ ۶۱۴؎ ۶۱۵؎ ۶۱۶؎ ۶۱۷؎ ۶۱۸؎ ۶۱۹؎ ۶۲۰؎ ۶۲۱؎ ۶۲۲؎ ۶۲۳؎ ۶۲۴؎ ۶۲۵؎ ۶۲۶؎ ۶۲۷؎ ۶۲۸؎ ۶۲۹؎ ۶۳۰؎ ۶۳۱؎ ۶۳۲؎ ۶۳۳؎ ۶۳۴؎ ۶۳۵؎ ۶۳۶؎ ۶۳۷؎ ۶۳۸؎ ۶۳۹؎ ۶۴۰؎ ۶۴۱؎ ۶۴۲؎ ۶۴۳؎ ۶۴۴؎ ۶۴۵؎ ۶۴۶؎ ۶۴۷؎ ۶۴۸؎ ۶۴۹؎ ۶۵۰؎ ۶۵۱؎ ۶۵۲؎ ۶۵۳؎ ۶۵۴؎ ۶۵۵؎ ۶۵۶؎ ۶۵۷؎ ۶۵۸؎ ۶۵۹؎ ۶۶۰؎ ۶۶۱؎ ۶۶۲؎ ۶۶۳؎ ۶۶۴؎ ۶۶۵؎ ۶۶۶؎ ۶۶۷؎ ۶۶۸؎ ۶۶۹؎ ۶۷۰؎ ۶۷۱؎ ۶۷۲؎ ۶۷۳؎ ۶۷۴؎ ۶۷۵؎ ۶۷۶؎ ۶۷۷؎ ۶۷۸؎ ۶۷۹؎ ۶۸۰؎ ۶۸۱؎ ۶۸۲؎ ۶۸۳؎ ۶۸۴؎ ۶۸۵؎ ۶۸۶؎ ۶۸۷؎ ۶۸۸؎ ۶۸۹؎ ۶۹۰؎ ۶۹۱؎ ۶۹۲؎ ۶۹۳؎ ۶۹۴؎ ۶۹۵؎ ۶۹۶؎ ۶۹۷؎ ۶۹۸؎ ۶۹۹؎ ۷۰۰؎ ۷۰۱؎ ۷۰۲؎ ۷۰۳؎ ۷۰۴؎ ۷۰۵؎ ۷۰۶؎ ۷۰۷؎ ۷۰۸؎ ۷۰۹؎ ۷۱۰؎ ۷۱۱؎ ۷۱۲؎ ۷۱۳؎ ۷۱۴؎ ۷۱۵؎ ۷۱۶؎ ۷۱۷؎ ۷۱۸؎ ۷۱۹؎ ۷۲۰؎ ۷۲۱؎ ۷۲۲؎ ۷۲۳؎ ۷۲۴؎ ۷۲۵؎ ۷۲۶؎ ۷۲۷؎ ۷۲۸؎ ۷۲۹؎ ۷۳۰؎ ۷۳۱؎ ۷۳۲؎ ۷۳۳؎ ۷۳۴؎ ۷۳۵؎ ۷۳۶؎ ۷۳۷؎ ۷۳۸؎ ۷۳۹؎ ۷۴۰؎ ۷۴۱؎ ۷۴۲؎ ۷۴۳؎ ۷۴۴؎ ۷۴۵؎ ۷۴۶؎ ۷۴۷؎ ۷۴۸؎ ۷۴۹؎ ۷۵۰؎ ۷۵۱؎ ۷۵۲؎ ۷۵۳؎ ۷۵۴؎ ۷۵۵؎ ۷۵۶؎ ۷۵۷؎ ۷۵۸؎ ۷۵۹؎ ۷۶۰؎ ۷۶۱؎ ۷۶۲؎ ۷۶۳؎ ۷۶۴؎ ۷۶۵؎ ۷۶۶؎ ۷۶۷؎ ۷۶۸؎ ۷۶۹؎ ۷۷۰؎ ۷۷۱؎ ۷۷۲؎ ۷۷۳؎ ۷۷۴؎ ۷۷۵؎ ۷۷۶؎ ۷۷۷؎ ۷۷۸؎ ۷۷۹؎ ۷۸۰؎ ۷۸۱؎ ۷۸۲؎ ۷۸۳؎ ۷۸۴؎ ۷۸۵؎ ۷۸۶؎ ۷۸۷؎ ۷۸۸؎ ۷۸۹؎ ۷۹۰؎ ۷۹۱؎ ۷۹۲؎ ۷۹۳؎ ۷۹۴؎ ۷۹۵؎ ۷۹۶؎ ۷۹۷؎ ۷۹۸؎ ۷۹۹؎ ۸۰۰؎ ۸۰۱؎ ۸۰۲؎ ۸۰۳؎ ۸۰۴؎ ۸۰۵؎ ۸۰۶؎ ۸۰۷؎ ۸۰۸؎ ۸۰۹؎ ۸۱۰؎ ۸۱۱؎ ۸۱۲؎ ۸۱۳؎ ۸۱۴؎ ۸۱۵؎ ۸۱۶؎ ۸۱۷؎ ۸۱۸؎ ۸۱۹؎ ۸۲۰؎ ۸۲۱؎ ۸۲۲؎ ۸۲۳؎ ۸۲۴؎ ۸۲۵؎ ۸۲۶؎ ۸۲۷؎ ۸۲۸؎ ۸۲۹؎ ۸۳۰؎ ۸۳۱؎ ۸۳۲؎ ۸۳۳؎ ۸۳۴؎ ۸۳۵؎ ۸۳۶؎ ۸۳۷؎ ۸۳۸؎ ۸۳۹؎ ۸۴۰؎ ۸۴۱؎ ۸۴۲؎ ۸۴۳؎ ۸۴۴؎ ۸۴۵؎ ۸۴۶؎ ۸۴۷؎ ۸۴۸؎ ۸۴۹؎ ۸۵۰؎ ۸۵۱؎ ۸۵۲؎ ۸۵۳؎ ۸۵۴؎ ۸۵۵؎ ۸۵۶؎ ۸۵۷؎ ۸۵۸؎ ۸۵۹؎ ۸۶۰؎ ۸۶۱؎ ۸۶۲؎ ۸۶۳؎ ۸۶۴؎ ۸۶۵؎ ۸۶۶؎ ۸۶۷؎ ۸۶۸؎ ۸۶۹؎ ۸۷۰؎ ۸۷۱؎ ۸۷۲؎ ۸۷۳؎ ۸۷۴؎ ۸۷۵؎ ۸۷۶؎ ۸۷۷؎ ۸۷۸؎ ۸۷۹؎ ۸۸۰؎ ۸۸۱؎ ۸۸۲؎ ۸۸۳؎ ۸۸۴؎ ۸۸۵؎ ۸۸۶؎ ۸۸۷؎ ۸۸۸؎ ۸۸۹؎ ۸۹۰؎ ۸۹۱؎ ۸۹۲؎ ۸۹۳؎ ۸۹۴؎ ۸۹۵؎ ۸۹۶؎ ۸۹۷؎ ۸۹۸؎ ۸۹۹؎ ۹۰۰؎ ۹۰۱؎ ۹۰۲؎ ۹۰۳؎ ۹۰۴؎ ۹۰۵؎ ۹۰۶؎ ۹۰۷؎ ۹۰۸؎ ۹۰۹؎ ۹۱۰؎ ۹۱۱؎ ۹۱۲؎ ۹۱۳؎ ۹۱۴؎ ۹۱۵؎ ۹۱۶؎ ۹۱۷؎ ۹۱۸؎ ۹۱۹؎ ۹۲۰؎ ۹۲۱؎ ۹۲۲؎ ۹۲۳؎ ۹۲۴؎ ۹۲۵؎ ۹۲۶؎ ۹۲۷؎ ۹۲۸؎ ۹۲۹؎ ۹۳۰؎ ۹۳۱؎ ۹۳۲؎ ۹۳۳؎ ۹۳۴؎ ۹۳۵؎ ۹۳۶؎ ۹۳۷؎ ۹۳۸؎ ۹۳۹؎ ۹۴۰؎ ۹۴۱؎ ۹۴۲؎ ۹۴۳؎ ۹۴۴؎ ۹۴۵؎ ۹۴۶؎ ۹۴۷؎ ۹۴۸؎ ۹۴۹؎ ۹۵۰؎ ۹۵۱؎ ۹۵۲؎ ۹۵۳؎ ۹۵۴؎ ۹۵۵؎ ۹۵۶؎ ۹۵۷؎ ۹۵۸؎ ۹۵۹؎ ۹۶۰؎ ۹۶۱؎ ۹۶۲؎ ۹۶۳؎ ۹۶۴؎ ۹۶۵؎ ۹۶۶؎ ۹۶۷؎ ۹۶۸؎ ۹۶۹؎ ۹۷۰؎ ۹۷۱؎ ۹۷۲؎ ۹۷۳؎ ۹۷۴؎ ۹۷۵؎ ۹۷۶؎ ۹۷۷؎ ۹۷۸؎ ۹۷۹؎ ۹۸۰؎ ۹۸۱؎ ۹۸۲؎ ۹۸۳؎ ۹۸۴؎ ۹۸۵؎ ۹۸۶؎ ۹۸۷؎ ۹۸۸؎ ۹۸۹؎ ۹۹۰؎ ۹۹۱؎ ۹۹۲؎ ۹۹۳؎ ۹۹۴؎ ۹۹۵؎ ۹۹۶؎ ۹۹۷؎ ۹۹۸؎ ۹۹۹؎ ۱۰۰۰؎

اس کا صدر منتخب فرمایا۔ میری علمی مصروفیتیں جو سرکاری ملازمت سے وظیفہ پر سبکدوشی حاصل کرنے کے بعد بہت بڑھ گئی تھیں مجھ کو اجازت نہیں دیتی تھیں کہ اس قسم کا بار اٹھاؤں لیکن احباب کا تقاضا اور اس وقت کی فضا دونوں نے مجھ کو مجبور کیا کہ اس کا رخیر کے لئے بھی وقت نکالا جائے۔

چند ہی دنوں بعد مجلس انتظامی نے تصفیہ کر لیا کہ حسب روایات سابقہ کانفرنس اپنا سالانہ اجلاس عام منعقد کیا کرے اور اپنے دائرہ عمل کو قدیم دست پر پہنچا کر حاضرہ تعلیمی مسائل سے باخبر رہنے کی کوشش کرے۔ سلا حال کے جلسہ کی صدارت کا جب سوال پیش ہوا تو مجھ غریب ہی کو ازراہ محبت منتخب فرمایا۔ میں نے ہر چند عذرات پیش کئے کہ وقت متعدد قومی کام میرے تفویض ہو گئے ہیں اور میرے خالص علمی مشغلہ کو ان سے بہت حرج پہنچ رہا ہے، لیکن کوئی عذر تسلیم نہیں کیا گیا اور ارشاد ہوا کہ زمانہ کے تغیر و تبدل کے لحاظ سے تعلیم کے مسائل بھی بدلتے جاتے ہیں۔ موجودہ حالات کے مد نظر اپنے خیالات ظاہر کروں۔



موجودہ ہندو دنیا

کی تعلیمی فضا پر ایک سرسری نظر

میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تمام دنیا میں عہد حاضر کے جملہ مسائل انتہا درجہ پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اہل مغرب کو گزشتہ پچاس سال میں آب و آتش خاک و باد پر اس قدر سرعت کے ساتھ دسترس حاصل ہوا اور انہوں نے سائنس کی مدد سے اپنے آرام و سائیش کے ذرائع ہم پہنچانے میں ایسی نمایاں کامیابی حاصل کی کہ ان کا ایک ہی اثر گردہ اپنے غرو میں انسانی زندگی کے ابتدائی اصول ہی کو نظر انداز کرنے لگا۔ فطرت کے چند راز معلوم کر لینے کے بعد یہ گردہ انسان کی اصلیت کو بھی فراموش کر گیا۔ علم مرگت پھر دی و موانست جو ترقی یافتہ حیوانات کے بھی خصوصیات طبعی میں داخل ہیں اور جن کی بدولت انسان وحشی درندوں کے زمرہ سے نکل کر اپنا نیا جہم قائم کیا ہے اس گردہ کی نظر میں کمزوری کی علامتیں دکھائی دینے لگیں۔ مذہب و ہم پرستی کا مرادف سمجھا جانے لگا۔ دین و ایمن سہولت و افادیت کے نایج قرار دئے گئے۔ اپنی اکیسویں و بیسویں صدیوں کا تمدن و اسماں کا تقادوت حائل کیا گیا اور ایسے ماحول میں ذہنیت کو مسخر کر کے قویت کو تشکیل دینے کے لئے تعلیم جیسی پاک و متبرک چیز پر دبا گندے کا ذریعہ بنائی جانے لگی۔ زاری حکومت کے سقوط کے بعد نہ صرف روں میں یہ جابرانہ طریقہ رائج ہوا بلکہ اس کی مادی ترقیوں سے متاثر ہو کر جرمنی، اٹلی اور دیگر ممالک نے بھی اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے ضروری تغیر و تبدل کے ساتھ اس جابرانہ طریقہ کو اختیار کر لیا۔ اندیشہ ہے کہ ہندوستان کی سپلک فضا بھی کہیں کہیں عصر جدید کے اس غلط طریقہ تعلیم سے شاید متاثر ہو جائے لیکن انگلستان بشمول نوآبادیات اور امریکہ وغیرہ ہنوز اس جڑے اثر سے مصون و متبر ہیں۔

عہد حاضر کی اس خوفناک تصویر کو دیکھ کر کوئی شخص اطمینان کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ جو کچھ دیکھنے میں آرہا ہے۔ ہندیب ہی کا نتیجہ تصور کیا جا رہا ہے۔ پس میں متنبہ ہو جانا چاہئے کہ روس جرمنی اور اٹلی جیسے ممالک کی ظاہری مادی ترقی کو دیکھ کر ان کے اصول تمدن و تعلیم کی اندھی تقلید سے پرہیز کریں۔

تعلیم کا صحیح مقصد انسان کا ذہنی و جسمانی، دماغی، اخلاقی اور تعالے۔ فطرت ہی نے ہم کو تعلیم کی تلقین کی ہے اور اپنے روز ازل کے نافذ کردہ طریقہ کے بموجب ہماری تخلیق کے ساتھ ہمارے دلوں میں اس کا بیج بوکر ہم سے توقع کرتی ہے کہ ہم اپنے قوائے احساس و ادراک کی مدد سے اس کی پرورش کریں اور اس کے نشو و نما سے فائدہ

اٹھائیں۔ چنانچہ حیاتیات کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اسی راستہ سے بلکہ نہ صرف دیگر حیوانات پر فوقیت حاصل کر سکا بلکہ بتدریج کلیات فطرت سے واقف ہو کر اپنے گرد پیش کی سب چیزوں کو سخر و محکوم کرنے کا حازم ہوا۔ درحقیقت اسی جدوجہد کے ذریعہ اس میں تہذیب و شائستگی پیدا ہو سکی۔ بچان مادہ اور کمتر پایہ کے حیوانات پر اس کو جو مسل فتح حاصل ہونے لگی اس کا نشہ اس کی یاد سے شائستگی کی حقیقت ہی کو مہلا دیا جو اس نے ہزار ہا سال کے تجربہ کے بعد سیکھی تھی۔

بنی نوع انسان کا مقامی و موقت خفیف امتیازات کے لحاظ سے مختلف گروہوں یا قوموں میں منقسم ہو کر اپنی محدود جاعتوں میں کامل اتحاد کی زندگی بسر کرنا اور ساتھ ہی اپنے بنی نوع (جنکو بنی عم کہنا بجا نہ ہوگا) کے دوسرے گروہوں کے ساتھ ملنساری اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنا فطرت ہی کا سکھایا ہوا سبق تھا اور اسی سبق کی مدد سے انسان انسان بنا۔ لیکن قسمی سے یہ خوبیاں اس کی طبیعت کا جزو لاینفک صرف اس وقت تک رہیں کہ وہ دوری و موسمی انقلابات کی صعوبت سے ہراساں رہا و بعد برق زلزلہ اور وبائی بیماریوں کے نقصانات کی سرعت کے ساتھ تلافی نہ کر سکا۔ اب جبکہ اس نے ان آیاتِ سماوی کے ظاہری اسباب سے یک گونہ واقفیت حاصل کر کے اگر ان کے کامل انہاد کے تدابیر نہیں معلوم کر کے تو کم از کم ان پر اتنا دہترس حاصل کر لیا ہے کہ اپنے دنیاوی کاروبار کو ان سے بہت کم متاثر ہونے دیتا ہے۔ اپنی ماں پیت کی سکی ہوئی خوبیوں کو ترک کرنا شروع کر دیا جانوروں اور بیجاں مادہ پر غلبہ پالینے کے بعد خود اپنی بنی نوع کو سخر کرنے کی دھن میں پڑ گیا۔ گویا اجتماعی خود کشی پر آمادہ ہو گیا۔

سائنس کیساتھ مغرب کی مادی ترقی

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب کی عالیہ مادی ترقی سائنس ہی کی مدد سے ہوئی ہے۔ ہمارا سائنس نے زیادہ تر خالص تلاش حقیقت کے جذبہ میں دنیا و مافیہا سے کنارہ کشی کر کے اپنے انقلاب انگیز معلومات شائع کئے اور ان سے فائدہ اٹھا کر مفکرین کے ایک دوسرے طبقہ نے خیر کی امداد اور شر کے انہاد کی نیت سے روز افزوں قوت و رسائی کے آلات و ایجادات، مرکبات و مفردات ایجاد کئے، لیکن افوس صد افوس کہ ذی اقتدار و سرمایہ دار جنگجو قوموں نے ان کو دوسرے ہی کاموں پر لگا دیا جس کی وجہ سے دنیا کا امن مہر و شش ہو گیا۔ مدافعت کے نام سے محاربت و مجاہدت کے سامان کثیر مقدار میں جمع ہونے لگے اور وہ چیزیں جو حکمت و تحقیق کی بہترین پیداوار تصور ہو سکتی تھیں عالمگیر قتل و غارتگری کے ذرائع بن گئیں۔ اس بات کی ذمہ داری سائنس یا اس کے شیدائیوں کے سر تو ہونا سراسر نا انصافی ہے

حقیقی ذمہ دار دراصل وہ لوگ ہیں جو ان نعمتوں کا بجا استعمال کرتے ہیں۔ بقول حضرت سعدیؒ
ترائیشہ دادم کہ ہینم شکن یہ گفتہ کہ دیوار مسجد بکن۔

زہریلی گیہوں اور تباہ کن برب کے گولوں سے جیشہ وغیرہ کی بہتی اور نادار قوموں پر اٹلی نے جو آفتیں
ڈھالی ہیں اور ہلک اسلحہ و آلات حرب کی تیاری سے رتی یافتہ اقوام کے خزانوں پر جو ناقابل برداشت بار
پڑ رہے ہیں اور عامہ خلایق میں ہمسایہ ممالک کے اچانک حملوں کے خوف سے جو اضطراب و اضطراب پھیلتا جا رہا ہے
مستلج بیان نہیں۔

مہذب و تعلیم یافتہ دنیا کو اس عالمگیر تباہی سے نجات دلانے کا واحد طریقہ اصلاح تعلیم ہے۔ قومیت
کا واجبی احساس تہذیب و شایستگی کے لئے جس طرح مفید ہے اسی طرح اس کا غلو بھی سخت مضر ہے۔ بنی نوع انسان
کو اوائل عمر میں اگر ایشائی مفکرین کے پسند و نصائح سے مناسب طریقہ پر روشناس کرایا جائے تو کیا عجب کہ دنیا میں پھر سے
امن و اطمینان کا دور دورہ شروع ہو جائے۔ اس سے بہتر کیا استدلال پیش ہو سکتا ہے کہ
بنی آدم اعضائے یک دیگرند کہ در آفرینش زیک جو ہرند
چو عضوے بدر آدور و روزگار دگر عضو ہمارا نسا ندرار

مختلف ممالک کے ماہر ان سائنس اور مدبرین کی ایک بڑی جماعت نے دنیا کو اس ہیبت ناک خطرہ سے بچانے
کے لئے جو تدابیر و تجاویز پیش کئے ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ نصاب تعلیم میں حیاتیات کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہئے
تاکہ مستعلم کو معلوم ہو سکے کہ انسان کیا ہے زندگی کسے کہتے ہیں اور ارتقاء کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ جبرنی اختلافات کا قوموں
کی تعمیر و تخریب پر کیا اثر رہا۔ جو علم اندوزوں تاریخ کے نام سے مشہور ہے وہ بنی نوع انسان کی تاریخ بھلانے کا کس صہک
مستحق ہے۔ واقعات کے ساتھ مطبوعہ بیانات کہاں تک منطبق ہو سکتے ہیں اور سچائی کے معلوم کرنے کا قابل اعتماد طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔
اسی طرح سائنس کے محکومات اور انہر قائم کردہ نظریوں میں کیا فرق ہے۔ جہلا کا نام خیال کہ سائنس منکرات
باری ہے اور مذہب و دین و آئین کا منافی سراسر بہتان ہے۔ اس موقع پر میں واربرگ (Warburg) نامی
ایک جدید بلند پایہ محقق کا مقلد پیش کرتا ہوں جو اس نے حیاتیات کی ایک سنسنی خیز تحقیق کے ضمن میں کہا تھا اس کا تعلق
در اصل جاندار اجسام سے خارج ہونے والی شعاعوں سے تھا بھوت پریت سے نہیں۔

In Science one cannot prove there are no ghosts. ایسی صورت میں سائنس کو

منکرات باری قرار دینا بہتان نہیں تو پھر کیا ہے۔

مذہبی تعلیم سے استفادہ کی ضرورت

یورپ میں جس طرح حیاتیات کے ذریعہ بنی نوع انسان کی حقیقی یگانگت کی تلقین پر زور دیا جا رہا ہے، ایشیائی ممالک علی الخصوص ہندوستان میں مذہبی تعلیم کے ذریعہ یہ بات آسانی حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی مذہب کا عالم اگر وہ عالم کہلانے کا مستحق ہو تو تمام مذاہب میں خیر و شر کے مابین ایک ہی قسم کا آئینہ ساز اور اخلاق کے ایک ہی نوع کے اصول دیکھتا ہے۔ رسم و رواج کی تفصیلات سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو تمام مذاہب بنی نوع انسان کے اتحاد کے حامی نظر آئیں گے۔ ہیں چاہئے کہ مذہب کے ان اساسی کلیات و ارشادات سے فائدہ اٹھائیں اور روئے زمیں سے فتنہ و فساد کو جڑ سے اکھڑ کر پھینکیں۔

ہندوستان کی موجودہ تعلیمی فضا

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے موجودہ ہندو مذہب دنیا کی مکدر فضا کے علمی مسائل اور ان کے اصولی حل کی تفہیم کافی وقت صرف کیا ہے۔ اب مجھے چاہئے کہ ہندوستان کے عالیہ تعلیمی اداروں اور اسکیموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں اور اس کے ساتھ ساتھ ممالک محروسہ سرکار عالی کے جدید تعلیمی تجاویز کے متعلق جہاں تک سررشتہ کی شائع کردہ رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کچھ مخلصانہ خیالات اور اپنے دیرینہ تجربہ پر مبنی مشورے پیش کروں۔ میں پہلے ہی سے یقین دلاتا چاہتا ہوں کہ میرا نشانہ ہرگز نہیں ہے کہ سرکار عالی یا سرکار عظمت مدار کی عالیہ تعلیمی پالیسیوں پر نکتہ چینی کروں۔ جس شخص سے عیس سال تک سررشتہ تعلیمات نے ہر اہم کام میں مدد ملی اور جس کو جامعہ عثمانیہ کے ارتقائی دور میں سے سب سے زیادہ سربراہ و رہبر ادارہ کو ہندوستان میں بلند ترین معیار کمال تک پہنچانے کا موقع ملا ہو اس سے کیونکر ممکن ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی مترضانہ طرز اختیار کرے۔ اول تو اس کی خودداری اس کو بے طلب کے کوئی رہنے یا مشورہ دینے کی اجازت نہیں دیتی۔ جو کچھ بھی اب کہا جائیگا وہ محض اس وجہ سے کہا جائیگا کہ کانفرنس ملک کے علماء و علم دوست حضرات کی ایک ممتاز جماعت ہے اور اس کو اپنا نمایندہ منتخب فرمایا ہے جو بھی مشورہ دیا جائیگا وہ اس نیت پر مبنی ہوگا کہ سررشتہ اس سے فائدہ اٹھائے اور ملک مخالفین کے اعتراضوں سے بچے۔ یہ ہندو متی الہیوں خود پہلک ہی پر واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ وہ حکومت کے ساتھ کس طرح ملک کی تعلیمی خدمت میں دوش بدوش

چل سکتی ہے اور کہاں تک اس کا ماتہ بنا سکتی ہے۔

آج کل ہندوستان بھر میں یہی سننے میں آ رہا ہے کہ تعلیم یافتہ بہت ہو گئے ہیں لیکن روزگار حاصل کرنے کے قابل بہت کم ہیں۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ یا تو ان کی تعلیم ایسی نہیں ہوئی ہے کہ وہ موجودہ نوکریوں کے قابل بن سکیں۔ یا نوکریاں ایسی نہیں ہیں کہ موجودہ طرز کے تعلیم یافتہ ان کے فرائض انجام دے سکتے ہوں۔ بہر حال دونوں قسم کے نقص کو شش بے رخ ہو سکتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کا اعلیٰ مطلب زیادہ تر یہی ہے کہ مستعلم ماہران علوم و فنون کے انتہائی علمی انجمنوں و تحقیقات سے روشناس کرائے جائیں اور اگر ممکن ہو تو مستعلم فارغ التحصیل ہو کر خود بھی اپنی ذمہ داری اور ذاتی کوششوں سے حدودِ علم کو وسیع سے وسیع تر بنائیں۔ واضح ہے کہ جب تک اس انتہائی کمال کے علماء بڑی تعداد میں تیار نہ ہوں موجودہ زمانہ کے معیار سے ملک ہند ب نہیں سمجھا جاسکتا! لیکن ساتھ ہی اس قسم کی تعلیم کے ادارے دنیا کے روزمرہ کاروباری خدمات کے لئے امیدوار پیدا کرنے کے لئے اگر ناموزوں نہیں تو براہ راست موزوں ہونا بھی لازمی نہیں ہے۔ پس حقیقی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ سررشتہ تعلیم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہی تعلیم کے ذرائع کا انتظام کیا جائے جو عامہ متعلمین کو نوکریوں کے قابل بناسکیں۔ اگر کسی ملک میں بدقسمتی سے باستاناں عہدوں کے جو چند خوش قسمت یا مقابلہ کے امتحانوں میں بقت لیجانے والوں یا ذی اثر لوگوں کو مل سکتے ہیں اور فوج و پولیس کی عام ملازمتوں کے جن کے لئے عموماً اعلیٰ تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی جاتی تقریباً جتنی بھی دوسری خدمتیں ہیں فشی گری یا اس کے ماثل نوع ہی کی ہوں تو نہ اعلیٰ تعلیم پر حرف رکھا جاسکتا ہے اور نہ اعلیٰ تعلیم کے طلبگاروں پر۔ خود ملازمتوں کی نوعیت تبدیلی کے قابل قرار دی جاسکتی ہے۔ مگر واضح ہے کہ بلا ضرورت خدمات کی نوعیت بدلنے سے اندیشہ ہے کہ جو کام اب چل رہا ہے اس میں رکاوٹ پیدا ہوگی ایسے ہی ناموافق ماحول میں وہ بدقسمت گروہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کو بعض سربراہانِ مرفہ بحالِ مدبر (Learned Beggars) کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ غالباً اس نام سے ان کا مقصد محض تعلیم یافتہ بھکاری (Educated Beggars) ہے عالم بھکاری نہیں۔ تعلیم یافتہ بھکاریوں کا وجود ہی انسانی تمدن کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ اگر کسی ملک میں علماء بھکاریوں کے زمرہ میں داخل ہو گئے تو اس ملک سے بدتر کوئی ملک نہ ہو سکیگا۔

ٹیکنیکل تعلیم کے رواج کے طریقے

تعلیم یافتہ بکاریوں کے اعداد کے لئے حال میں برطانوی ہند اور مالک محروسہ سرکار عالی میں بھی تجاویز سوچے گئے ہیں اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگرچہ میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے نہیں ہوں جن کی راپوس سررشتہ تعلیمات نے بطور خاص فائدہ اٹھانا چاہا تاہم میں نے سابق ناظم تعلیمات سے ایک مرتبہ ملاقات کر کے Re-organisation of Education سے متعلق سب کمیٹی کی رپورٹ حاصل کر لی۔ جہاں تک میں نے

اس کا مطالعہ کیا ہے پیش کردہ تجاویز مناسب حال معلوم ہوتے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ اس اسکیم کے جاری ہونے پر وہ طالب علم جو حقیقت اعلیٰ تعلیم سے استفادہ کرنے کے اہل نہیں ہیں ٹیکنیکل تجارتی یا ذرا معنی کا سوں میں روزگار سے لگ جائیں۔ لیکن اس ضمن میں چند امور کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اول تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انگلستان یا دیگر مغربی ممالک میں صنعتی مدارس سے پہلے صنعت و حرفت کے کارخانے قائم ہو گئے۔ اور جیسا کہ جی۔ اے۔ بین۔ لاندور کی

ایک مختصر حال ہی کی شائع شدہ کتاب مطبوعہ اسفرڈیو سوئیٹس پریس The Silent Social Revolution سے واضح ہوتا ہے ٹیکنیکل مدارس میں نہ صرف کارخانوں میں کام کرنے والے بچوں اور نوجوانوں کو ٹیکنالوجی وغیرہ کے باقاعدہ اصول سکھائے جاتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے لئے جو نو عمری میں اپنا اور اپنے والدین کا پیٹ پالنے کے لئے ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہی کارخانوں میں نوکر ہو جاتے ہیں ثانوی اور کچھ چھل تعلیم کے تشفی بخش ذرائع ہم پہنچانے کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔ بہر حال یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ ٹیکنیکل تعلیم سے جو توقع کی جاتی ہے وہ بدرجہ اتم اس وقت حاصل ہوگی جبکہ ملک میں صنعت و حرفت کو خاطر خواہ فروغ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس مبارک دن کے انتظار میں ٹیکنیکل مدارس کا افتتاح ملتوی رکھنا دانشمندی کا شیوہ نہ ہوگا۔ کیا عجب کہ یہ صنعتی مدارس خود آگے چلکر دور اندیش سرمایہ داروں کو صنعتی کارخانے قائم کرنے کی ترغیب دلائیں۔

صنعتی کارخانوں کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے سامنے ان شکستہ دل جان بلب لوگوں کی صورتیں حاضر ہو جاتی ہیں جنہوں نے اپنی عمر بھر کی مختصر کمائی ملک کی خدمت کے شوق اور حلال فائدہ کی ہوس میں مہم بالشان ڈرا کر کمزروں کے عیب ناموں سے گردیدہ ہو کر کارخانوں کے حصص خریدنے میں خرچ کر دی اور بعد کو کارخانوں کے دیوالیہ ہونے کے ساتھ تباہ و تاراج ہو گئے۔ اگر ان کو کوئی خیال خوشی دلا سکتا ہے تو شاید یہی کہ ان کی محنت کا پیسہ جب تک یہ کارخانے چل سکے

ان کے تخواہ دار ملازمین وغیرہ کو معتد بہ فائدہ پہنچاتا رہا۔ گویا ملک کی خدمت کا شوق پورا ہو گیا اور بس یہی حال بہار ملک کے چھوٹے بنگلوں کا ہے جو بد قسمتی سے ملک میں چاروں طرف پھیلنے جا رہے ہیں اور سینکڑوں خاندانوں کو برباد کر رہے ہیں۔ اگر حکومت ان امور کی طرف فوری توجہ کر کے مناسب تدبیر اختیار نہ کرے گی تو لوگ صنعت و حرفت و تجارت و بنگلہ کے نام سے ایسے ڈریں گے جیسے بچے کڑی دوا سے۔

صنعت و حرفت کی کامیابی کے تذہیر

مجھ سے بہ حیثیت ایک سائنس دان ہونے کے حال میں ایک مشہور ہندوستانی صنعتی سرمایہ دار نے جن کی شکر سازی وغیرہ کے کارخانے ملک کے مختلف حصوں میں کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ دریافت کیا کہ ملک کی صنعت و حرفت کی کامیابی کے لئے میں سب سے بڑھ کر کس چیز کو اہمیت دیتا ہوں۔ میں نے اسی وقت جواب دیا کہ پہلے ایمانداری کو اور پھر فنی واقفیت کو۔ انہوں نے یہ سن کر کہا کہ سالہا سال کے تبحر تجربہ نے انہیں بالکل یہی سبق سکھایا ہے جو میں نے ان کو سنایا۔ ایمانداری کی تعین تو اس زمانہ میں خدا ہی کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ البتہ فنی واقفیت اعلیٰ تعلیم اور بلند پایہ تحقیقاتی تجربہ خانوں کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ حکومت یا خود کارخانوں کی طرف سے سرکاری یا قومی ریسرچ کونسل منتخب ہو سکتی ہے جس میں خالص سائنس اور مختلف صنعتوں، زراعت وغیرہ کے صاحب کمال حتیٰ الاسکاں خدمت ملک ہی کی خاطر شریک ہو کر اپنے بیٹ فیت مشوروں سے مدد دے سکتے ہیں۔ گزشتہ ماہ جولائی کے سائنس اینڈ کلچر (Science and Culture) میں اسی کے مائل رائے ظاہر کی گئی ہیں۔

رہا یہ امر کہ سر دست ملک میں کون کون سی صنعتیں جاری کرنے کے قابل ہیں اور وہ کہاں کہاں جاری کیا جاسکتی ہیں اس کے لئے شاید سب سے اچھا طریقہ یہ ہو گا کہ پہلے دورہ کرنے والے عہدہ داران مال و تعلیمات اور ایسے معاملات سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب سے اس بارے میں رائے طلب کی جائیں۔ ان کے وصول ہونے پر محکمہ صنعت و حرفت سے مشورہ کر کے ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو اضلاع میں دورہ کر کے ایک معینہ مدت کے اندر مکمل رپورٹ پیش کر دے اور اس کے موجب یہ ادارہ کو دعوت دی جائے کہ نشانہ دار صنعتوں کیلئے کمپنیاں قائم کجائیں جن میں سرکار کی جانب سے بھی مناسب میں حصص خریدی جائیں یا عہدہ مدت قرضے دئے جائیں تاکہ ان کے کاروبار پر سرکار کی طرف سے کافی نگرانی رکھی جاسکے۔

ہندوستان اپنے آپ کو زراعتی ملک تصور کر رہی ہے اور اس کو صنعت و حرفت کے میدان میں غم کے ساتھ قدم رکھنے کا حق

نہ ملا۔ ریاست میں نے شاید اس کام میں تعلیم کی ہر جہد ربا باد کو بھی چاہا کہ اس طرف جلد توجہ کرے تاکہ آنیزانی لوگوں کے مسائل کے مفید قابل اعتماد طریقے
زراعت کی ترقی کے متعلق قبل انہیں تحریک کی جا چکی ہو کہ جامعہ میں اسکا ایک شعبہ کھول دیا جائے اور اسکے فارغ التحصیل طلبہ کو خاندانی تعلیم
مالی حالت اور بہت کے لحاظ سے رعایت پر زمینات دیکر انہیں موقع دیا جائے کہ اپنے آپ کو اس کام کیلئے موزوں ثابت کریں۔

ہماری جامعات کے معلم و متعلم

ہندوستان کی جامعات کے تعلیمی نتائج پر تنقید کرنے والے خود ہندوستانی حضرات کی اکثر یہی رائے
پڑھی گئی کہ ان میں تعلیم پانے والے زیادہ تر اعلیٰ تعلیم کے ناقابل میں جو محض کوئی اور کام یا دھندہ نہ ملنے کی وجہ
جامعات میں داخل ہو کر ڈگری کے سہارے تحریری مدرسی وغیرہ کے مثل خدمات پر مامور ہونا چاہتے ہیں۔ جہاں تک
میں نے خود غور کیا ہے یہ خیال ایک مدہمک ضرور صبح ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہند کی جامعات کے اکثر
ناکامیاب طلبہ یورپ یا امریکہ جاکر کوئی نہ کوئی لیلان لئے بغیر نہیں لوٹتے تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ
ان بیرونی ممالک میں تعلیم بہتر ہوتی ہے یا وہاں کے امتحان زیادہ معقول ہوتے ہیں۔ پس ہند کی جامعات میں
ابھی اصلاح تعلیم کی بہت گنجائش ہے اور یہاں کے امتحانوں کے طریقے بھی محتاج ترمیم ہیں مغربی جامعات میں
پڑھانے والے استاد یا پروفیسر ہند کی جامعات کے پروفیسروں سے (باستثناء چند) یقیناً زیادہ قابل اور زیادہ
فرض شناس ہوتے ہیں۔ قبل اس کے کہ طلبہ کی قطعی نااہلی تسلیم کر لی جائے۔ ہیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہماری
جامعات کے استاذہ تعلیم کے زیادہ دلدادہ ہوں اور طلبہ کی تعلیم و تشویق کی طرف زیادہ توجہ کریں۔ معلم کی شکستگی واضح
و ذانت کو معلم کی توجہ کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ کیمبرج کے ایک مشہور ریاضی کے کوچ (استاد) کی نسبت یہ
قصہ مشہور ہے کہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی جامعوں میں کسی مبارقاہیت کا متعلم بھی خراب ہو کر اعلیٰ درجہ ریٹرن ہو سکتا
ہے بشرطیکہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے روایات اگرچہ تمدد ایام و مکان ازافہ کے ساتھ اصلیت سے بہت کچھ متجاوز
ہو جاتی ہیں۔ برس ہم جن لوگوں کو یورپ کے ماہران فن کی حقیقی شاگردی نصیب ہوئی ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ
ان بزرگ ہستیوں کا اثر متعلم کی ذہنی و دماغی ارتقا پر کس قدر زبردست ہوتا ہے۔

فن تعلیم سے مجھ کو عمر بھر کا تعلق رہا ہے۔ اسکول اور کالج کے ہر قسم کے طالب علم میرے شاگرد رہے ہیں۔
سالہا سال کے تجربہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو طالب علم اچھے استاد کی شفقت سے محروم رہتا ہے علم کے
میدان میں بہت کم بہت لیجاتا ہے تحقیق و تجسس کی بلندی تک اس کی پرواز قریب قریب ناممکن ہے تا وقتیکہ اس کا

رہناگر اس کو اپنا سعادتمند چیلان تصور نہ کرے۔ تعلیم کے ابتدائی مدارج میں بھی اگر اس کو فرض شناس، برہنہ کی دستگیری نصیب نہ ہو تو اس کی عمر کا بڑا حصہ رائیگاں جاتا ہے۔ اکثر طلبہ ریاضی، انگریزی اور سائنس میں کمزور رہنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان بچاروں کو ابتدائی جماعتوں میں ایسے مدرسوں سے سابقہ پڑتا ہے جو خود ان مضامین سے دلچسپی نہیں رکھتے اور نہیں جانتے کہ مندی کی دقتیں کیا ہیں اور کیسے رفع ہو سکتی ہیں۔

حیدرآباد میں مزید محققین کی ضرورت

گوشہ چند سال میں اٹھ شدہ بارے ملک میں چند قابل تعریف طالب علم پیدا ہو گئے۔ اور چونکہ انکی اچھی دیکھ بھال کی گئی اور ان کو بھلا سے وظائف دنیا کی بہترین درسگاہوں میں تعلیم دلائی گئی انھوں نے نہ صرف امتحانوں میں اچھے درجے حاصل کئے بلکہ ان درسگاہوں سے واپس آنے کے بعد بھی تحقیق و تجسس کا سلسلہ قائم رکھا اور اپنے ہمشیموں میں اعزاز و امتیاز حاصل کیا۔ اس میں سے اکثر و بیشتر میرے زمانہ صدارت کلیہ جامعہ عثمانیہ کے شاگرد ہیں میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر ملک کے مفاد کی غرض سے کہہ سکتا ہوں کہ لائق طالب علم زیادہ تر بنانے ہی سے بنتے ہیں۔ البتہ بنانے والے میں اتنی بصیرت ضرور ہونی چاہئے کہ وہ دیکھے کہ کون کون طالب علم بلند پروازی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کن مضامین کے لئے ان کے داغ موزوں ہیں اور ان کو کس حد تک آزاد چھوڑ سکے ہیں۔ ایسے ہونہاروں کی پرکھ کے لئے میں نے حضرت سعدی کے ان اشارے سے سبق سکھا ہے جو بظاہر کسی دوسرے ہی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کہے گئے ہیں۔

کی راہ پر گم شد از رحلہ	سب با گہ برگزید در تافلہ
زہر خمیہ پر سید و ہر سوشناقت	بہ تار کی آن روشنائی بیافت
چو آمد بر مردم کار داں	شنیدم کہ می گفت با ساربان
نہ دانی کہ چون راہ بر دم بدوست	ہر آنکس کہ پیش آمدم گفتم دوست

میں نے کلیہ کے ہر طالب علم کو پہلے علم کا سچا طالب اور ترقی کا مستحق سمجھا جو اس حق نطن کے غیر مستحق تھے بلکہ چھٹ گئے اور اچھے جو ہر ماٹھ آگئے۔

یہ قابل افراد اب ملک کے مختلف حشر رشتوں میں اچھی خدمتوں پر مامور ہیں ان میں بعض اب بھی کارہائے تحقیق و کاوش میں مصروف ہیں۔ لیکن میری ماہے میں ایسے انخاص کی موجودہ تعداد بالکل ناکافی ہے۔ ہر مضمون میں کم از کم چار

پانچ بلند پایہ کے محقق تیار ہونے چاہئیں۔ جن کو مستقل اور موزوں خدمات ملنے تک مسلسل معقول رتنی امداد عطا ہوتی چاہئے تاکہ ان کو یک گونہ استغنیٰ نصیب ہو اور وہ بلا فکر و تردد اپنے کاموں پر لگے رہیں۔ اعلیٰ تعلیم کا کوئی ادارہ عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا تا وقتیکہ اس میں بلند پایہ تحقیقاتی کام مسلسل جاری نہ رہے اور یہ کام خود اس ادارہ کی رائے میں نہیں بلکہ مستند نقادوں فن کی رائے میں قابل قدر منظور ہونا چاہئے۔ واضح ہے کہ ایسے اعلیٰ تحقیقاتی کاموں کیلئے ساز و سامان کی بھی ضرورت ہے ان پر جو کچھ روپیہ صرف ہو گا بیکار نہ جائیگا بشرطیکہ یہ ساز و سامان تجربہ کار ماہران فن کے مشورے سے خریدا جائے اور کام کی وقتاً فوقتاً تنقید ہوتی رہے۔

دولتمند اصحاب کے اشتراک عمل کی ضرورت

اس موقع پر میں ملک کی ان متمول ہستیوں کو خاص طور پر مخاطب کرنا چاہتا ہوں جن کی فیاضانہ امداد سے ملک کی بہترین خدمت ہو سکتی ہے۔ دور عثمانی میں مہتمم کے تعلیمی اقتقادی اور رفاہ عام کے کاموں پر حکومت فیاضی کے ساتھ روپیہ خرچ کرتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن پبلک کی طرف سے اس میدان عمل میں محدودے چند خاص استثنیات کے سوا کوئی خاطر خواہ جولاہی دیکھنے میں نہیں آئی۔ میں نہیں بھٹاکتا کہ ہمارے ملک میں دولتمندوں کی کمی ہے۔ یہاں خاندانی امیروں کے علاوہ انتہاء درجہ متمول نمسکہ داروں اور سرمداروں کی ایک بڑی جماعت شان و شوکت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اگر ان حضرات کو ملک کی تعلیمی ضروریات کا احساس ہو جائے اور کاربھی راکینفر، بلفرڈ زویل اور لارڈ نفیلڈ جیسی فرض شناس ہستیاں ان کے لئے چراغ ہدایت بن جائیں تو کیا عجب ہے کہ حیدرآباد میں بھی تحقیق و تفحص کا دریا امنڈ آئے اور ہمارا ملک بڑا نوبی ہند سے کسی طرح پیچھے نہ رہے۔

ہماری موجودہ بے بساطی کا اس سے پہلے کیا کہ سرکاری خدمت سے ذلت پر غلغہ ہونے کے بعد میں نے کچھ دنوں سرعت کے ساتھ شباب ثاقب کی طبقات سے متعلق جو نتائج شائع کئے اس کی وجہ سے نہ صرف انگلستان و امریکہ کے اس فن کے اداروں نے مجھ کو اپنا رفیق کار بنالیا بلکہ ایک بین الاقوامی اسکیم میں بھی مجھ کو شرکت کی دعوت دی جس کے لئے ایک خاص قسم کی دور بین کے ذریعہ چند عجیبہ مشاہدات مطلوب تھے مجھے انوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسی دور بین ہندوستان میں دستیاب نہ ہونے سے میں دعوت کو قبول نہ کر سکا۔ انگلستان سے سگوانا چاہا لیکن اس کی قیمت مجھ غریب کے دست ہمت سے بلند تھی بعض مقامی متول حضرات کو یہ واسطیان سائی لیکن مسئلہ بیکاری سمجھ کر کسی کی توجہ اس کام کی طرف مبذول نہ ہوئی۔ میں اب بھی اپنے فنی کاموں میں تنہا ہوں اور جس طرح بھی ممکن ہو علم

کی خدمت کئے دیتا ہوں کیا خوب ہوتا کہ مالی مشکلات سے نجات ملتی۔

ہمارے امتحانات

ممالک غیر کے اساتذہ کی بہتر تعلیم و تفہیم کے ساتھ وہاں کے امتحانات کی بیشتر معقولیت کی طرف میں نے تھوڑی دیر پہلے اشارہ کیا ہے۔ اب اس مسئلہ کی تشریح کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ تمام دنیا روٹی ہے کہ امتحانات اور خصوصاً جامعات و سرشتہ ملازمت کے امتحانات نہایت درجہ صبر و استقامت اور بے اوقات ہمت شکن واقعہ ہوتے ہیں۔ ان کے نتائج سے الّا ان خوش قسمت امیدواروں کے جو کامیاب گردانے جاتے ہیں باقی سب غیر مطمئن رہتے ہیں۔ یہ تو انسان کی نفسیات کا ایک لازمی پہلو ہے کہ جو آزمائش امیدواروں کی امیدوں پر پانی پھیر دیتی ہے اس کے صحت عمل پر ان کو کم اعتماد ہوتا ہے۔ اب متعین کی مشکلات پر غور کیجئے۔ سوالات عموماً انھیں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں جو پرچے جانچنے پر مقرر ہوتے ہیں۔ خیر اگر سوالات بنانے والے اور جوابات دیکھنے والے مختلف ہوں بھی تو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جوابات دیکھنے والے معین امتحان کے سوالات کو اسی طرح سمجھتے اور باسانی مل کر سکتے ہیں جب ان کے پاس جوابات کے تو دے پہنچے لگے ہیں اور ایک معین وقت کے اندر ان کو تفصیلی نتائج معہ رپورٹ وغیرہ بھیجنے کی ہدایت وصول ہوتی ہے تو سب کلام چھوڑ کر وہ ان پرچوں کی جانچ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہر امیدوار کا طرز جواب الگ ہوتا ہے۔ خط خوب و زشت کے پورے پیام پر مادی ہوتا ہے اور معین کی ہندردی مختلف اوقات سحر و شام میں معدہ اور موسم کے اندرونی و بیرونی اثرات کے تابع رہتی ہے۔ ایسی حالت میں سوائے ریاضی کے چند شعبوں کے جوابات کے دوسرے مضامین کے جوابات کی یکسانیت کے ساتھ جانچ بڑے سے بڑے تجربہ کار و فہم شناس معین کے لئے بھی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض امتحانوں کے نتائج پر امیدواروں کی حقیقی قابلیت کا اندازہ بے اوقات قابل اعتماد نہیں ثابت ہوتا۔ اور بعض مصدقہ تعلیم یافتہ اشخاص کا مبلغ علم ہر قدم پر مزید تصدیق کا محتاج رہتا ہے۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن مسئلہ تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ میں امتحان کرنے کا کوئی ذریعہ امتحان سے آسان تر و دریا درزاں تر دنیا کو ابھی دستیاب نہیں ہوا۔ اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہماری جامعات کے امتحان بھی کم از کم پچھتر فیصد تک صحیح ہی جلتے ہیں۔

مشرقی جامعات کے امتحانوں میں سب سے بڑا اور مسئلہ یہ ہے کہ ان جامعات کے معین عموماً یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ امیدوار کون کونسی باتیں نہیں جانتا ہے اس کے برعکس مغربی جامعات کے امتحانوں میں اس امر کے دریافت کی

کوشش کی جاتی ہے کہ اسید دار اپنے مضمون سے متعلق کیا باتیں جانتا ہے اور کس حد تک صحیح جانتا ہے اس معقول مہل اگر ہماری جامعات بھی کار بند ہو جائیں تو اعلیٰ تعلیم سے بہت زیادہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں گے اور متعلمین کی ایک کثیر جماعت اپنے مین نوکے زمانہ میں حسرت و یاس کے پنجہ میں گرفتار نہ ہونے پائیگی۔

تفریح کے ذریعہ تعلیم

تعلیم اگر تفریح کے ذریعہ دی جائے تو اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ کم سن بچوں کے لئے تو اس کو لازمی قرار دیا جانا چاہئے اور ان دنوں ایسا ہی کیا جا رہا ہے نوجوانوں اور بوڑھوں کی تعلیم کے لئے بھی اسی طریقہ سے روز افزوں مدد ملی جا رہی ہے۔ ہمارے ملک میں ایک عرصہ سے کنڈرگارٹن سسٹم جاری ہے۔ مدرسہ عالیہ میں جب یہ شعبہ منتقل ہوا میں اس میں شریک تھا۔ مدرسہ کی اس وقت کی مناظر قدرت کی تصویروں اور کڑے سادی کے نقشوں کی رعنائیت ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ کیا عجب کہ انہیں خاموشی اثرات کی وجہ سے میں نے سائنس کے مختلف شعبہ جات سے گہری دلچسپی پیدا کی اور اب مشاہدات ہیئت میں مستغرق ہوں مجھے یقین ہے کہ یہ طریقہ دوسروں کے لئے بھی ایسا ہی محرک نقص ثابت ہو رہا ہے۔

ابھی ابھی مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ امریکہ میں بائے اسکاؤٹس (Boy Scouts) شہروں کے باہر اپنے کیمپ (خیمے) نصب کرتے ہیں تو ان کے سفیر رفیق مقامی ماحول کے مطالعہ کے ذریعہ انہیں اراضیات و معدنیات کے مبادیات سے جہاں تک علاقہ ممکن ہو روشناس کراتے ہیں اور ان کو عمدہ عمدہ نمونے جمع کرنے کا شوق دلاتے ہیں یہی طریقہ جزائی و تاریخی معلومات کی فراہمی کیلئے بھی اختیار کیا جا رہا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ ہمارے مدارس کے بچے بھی ایسے ذرائع کو ماتہ سے جانے نہ دیں گے۔

دکن کی سرزمین مل طلب مسائل کے قیمتی خزانوں کا مدفن ہے اوائل عمر سے ہی اگر منظم ان کی تلاش میں پڑ جائے تو آگے چل کر عجیب نہیں کہ وہ علم کی دنیا کے سامنے نادر انکشافات اور نئے نئے معیے پیش کر سکیں گے۔ ارضی طبیعیات سے متعلق میرے دو علمی مقالوں کا مواد ایسے ہی تفریحی و دعوتی میں فراہم ہوا۔

سفر سے بڑھ کر کوئی ذریعہ انسان کے قوائے جستجو کو حرکت میں لانے کا شکل سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ موسم اور شیشہ کی ندی ہوئی مخلوق کے قطع نظر اوسط جسمانی و دماغی صحت کا طالب علم سفر کی خفیف تکالیف کو نہ صرف برداشت کر سکیں گے بلکہ ہر وقت تیار رہتا ہے بلکہ ایک حد تک ان کا متلاشی بھی رہتا ہے۔ اگر وہ اپنی قوت آزمائی یا اظہار ہنرمندی کو

جذبات کو معقولیت کے حدود سے نجا دینا ہونے دے اور خواہ مخواہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اپنے والدین اور رفقا کو مصیبت و تکلیف میں گرفتار نہ کر اے تو تفریحی سفران کے لئے تعلیم و تربیت کے حذا داد مدرسے بن سکے ہیں۔
 عمل نموداری فرض شناسی بڑوں کی اطاعت و زنتقار کی امداد کفایت شعاری اور بلند ہمتی یہ سب چیزیں ہند ب ساتھیوں اور روشن خیال ہادی کی صحبت میں سیکھی جاسکتی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اکثر مدارس میں اب تفریحی سفر منظم طریقوں پر رائج ہو رہے ہیں۔

متحرک تصاویر کے ذریعہ بھی مغربی ممالک کے اکثر مدارس میں طلبہ کو مفید تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تصویریں محرک تعیش یا محزب اخلاق قصوں کی رجحانی نہیں کرتی ہیں بلکہ سائنس کی جدید انکشافات ارضی و سماوی مظاہر اور مختلف ممالک کے صنعتی و اقتصادی خصوصیات نہایت سلیقہ مندی کے ساتھ دیکھنے والوں کے سامنے پیش کرتی ہیں اگر ان کو ایک مقصور درسی کتاب سمجھ کر توجہ اور فکر کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا جائے تو ان پر جو روپیہ صرف ہوتا ہے بہت کار آمد ثابت ہوگا۔ ورنہ اگر ان سے محض دل بہلانے کا کام لیا جائے تو ان کا استعمال ہونا ہی اچھا جو خطرہ افلاطوں و ارسطو تالیس کے زمانہ میں صبح تھا اب بھی یہ مقولہ صحیح ہے کہ تعلیم کے لئے کوئی شاہی راستہ اختراع نہیں کیا جاسکتا۔

جہانی تربیت اور ورزش

چند ہی ماہ قبل میں نے فریکل ایجوکیشن ان جرمنی کے نام سے سرکاری طور پر لندن کے شائع کردہ ایک رسالہ کا مفصل مطالعہ کیا جس سے معلوم ہوا کہ جرمنی میں حکومت جس سرگرمی کے ساتھ سائنس کی تحصیل میں مصروف ہے اس کے برابر برادر جو انان ملک کی جہانی تربیت پر بھی روپیہ اور توجہ صرف کر رہی ہے خود رعایا کی جانب سے متعدد باقاعدہ انجمنیں قائم ہیں جنہیں متفقہ طور پر کوشش کی جاتی ہے کہ جرمن بچہ کمزور نہ رہ جائے یا اس کی جہانی صحت والدین کی کم نگاہی سے معرض خطر میں نہ پڑ جائے۔ اگرچہ اس سرگرمی کا اصلی نشاء ملک کو متوقعہ یا منتظرہ جنگ کے لئے تیار کرنا ہے لیکن قومیت کی تعمیر اور ملک کی تندرستی کو اس تحریک سے جو فوائد پہنچ رہے ہیں محتاج بیان نہیں ہیں۔ اگر نیک نیتی کیساتھ کسی سے رٹنے بھڑنے کے خیال سے نہیں بلکہ صحت جہانی کے تحفظ کی غرض سے ہمارے ملک میں بھی ایسے ادارے باجائز سرکار قائم کئے جائیں تو بہت اچھا ہوگا۔

تعلیم اناث اور اسکی روز افزوں اہمیت

اسلام کے زمانہ عروج کے تمدن ممالک کے سوا تمام دنیا میں سب جگہ عورتوں کو مردوں کے ہم پلہ حقوق سا ہا سال کی کوششوں اور جھگڑوں کے بعد ہی مل سکے اور ابھی تک ٹر ہے ہیں۔ تہذیب کے ابتدائی دور میں مردوں نے عورتوں کو مردانہ وقت تقسیم کار کے مفروضہ پر اپنی دفاعی قوت اور ذمہ داریوں کو زیادہ اہمیت دیکر عورتوں کیلئے جو قواعد و ضوابط نافذ کئے ان میں اولاً طبقہ اناث کو تعلیم کی نعمت سے یک گونہ محروم رکھنا ہی مناسب سمجھا گیا۔ بہتہ بہتہ جب معلوم ہونے لگا کہ اوسط عورت کا دماغ بھی تعلیم کے لئے بڑی حد تک ایسا ہی موزوں ہے جیسا کہ اوسط مرد کا اور تعلیم کی اشاعت عام طور پر بڑھنے لگی تو بتدریج عورتوں کو بھی حصول علم کے موقعے دئے جانے لگے۔ ہندوستان میں بھی نسوانی تعلیم کا ارتقاء اسی طریقہ پر ہوا۔ اور اب ریاست ٹرانس جوبہ جات بنگال، مدراس و بیہار وغیرہ میں بھی خاصی تعلیم یافتہ عورتیں کافی تعداد میں پیدا ہو رہی ہیں۔ حیدرآباد نے بھی گزشتہ چند سال سے اپنے ماں اس تعلیم کی رفتار کو تیز کر دیا ہے۔ لیکن جس طرح دور حاضر کے مدبر مردوں کو اعلیٰ تعلیم کی قربان گاہ پر اپنے آپ کو ہلاک کرتے دیکھ کر ہر اس سال ہو رہے ہیں، وقت آرہا ہے کہ عورتوں کو مردوں کے لئے بنائے ہوئے نصاب تعلیم کی ڈگریاں اور اسناد لیکر گھر سے باہر بھٹکتے دیکھ کر انسانی ارتقاء کے محقق حیران و پریشان رہ جائیں کہ آخر اس گمراہی کا نسل انسان کی ذہنی و اخلاقی تربیت پر کیا خطرناک اثر پڑے گا۔

میرا بزرگ یہ خیال نہیں کہ عورتوں کو اعلیٰ تعلیم سے روکا جائے مجھ کو اس بات پر اصرار ہے کہ جن لڑکیوں نے ابتدائی و ثانوی مدارج سے گزرتے وقت تعلیم کے اساسی مضامین، یعنی لسانیات، ریاضی، سائنس، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ سے اپنا خاص میلان طبع ظاہر کیا ہو اور شوق تکمیل ان کو جامعہ کی طرف لیجانا چاہتا ہے تو ان کے لئے ہر طرح کی سہولتیں پیدا کی جانی چاہئیں تاکہ وہ اپنے معراج کمال کو پہنچ سکیں میڈام کیوری (Cure) اور سوبینا کو دالیو کی (Sonja Kowalewski) جیسی عورتوں کی زندگی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبعیات اور ریاضی جیسے اناث کے لئے عموماً غیر مانوس فرض کردہ مضامین بھی بعض عورتیں معراج کمال کو پہنچا سکتی ہیں۔ کیمیا، نسوانی طب، موسیقی، انشاء پردازی اور سخن گوئی و فطرت ان کے ذوق و ذہنی جولانی کے سلسلہ میدان ہیں۔

بیرا ہم یہ ضرور ہے کہ لڑکیوں کو زیادہ تر ان کی ضروریات زندگی کی مناسبت ہی سے تعلیم دلائی جائے تاکہ ان کی آئندہ زندگی تنج نہ ہونے پائے۔ ابتدائی و ثانوی دور ختم کرنے کے بعد ان کو معیشت خانہ داری، سوزن کاری

حفاظ صحت، طب، نفسیات، پرورش و تربیت اطفال وغیرہ کی تعلیم دلا کر اگر ان کی ایسی خواہش ہو تو طیلان عطا کر جائیں۔ تاوقتیکہ آدمی کی ذہنیت میں زبردست انقلاب نہ پیدا ہو یا انسانی معاشرت بالکلیہ نہ بدل جائے عورتوں کا پسندیدہ ترین پیشہ خانہ داری ہی رہے گا۔ اس لئے ان کو بذریعہ تعلیم زیادہ تر ای کام کے لئے تیار کرنا مناسب ہو گا۔ مگر غیر معمولی حالات پامیلان طبع کے لحاظ سے ان میں سے کچھ فیصدی اگر خانہ داری کے ساتھ یا اس کے بغیر مشغلہ طبابت، تصنیف و تالیف یا کوئی قومی خدمت اختیار کرنا چاہیں تو موزونیت کا اطمینان ہونے پر ان کے سرپرستوں کی رضامندی سے ان کو ان فاضل کی بھی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ ہر حالت میں عورتوں کو بھی مردوں کی طرح تمدن و معاشرت کے لحاظ سے ایک مقررہ درجہ تک عام تعلیم ملنی چاہئے تاکہ انسان ایک عین میاں تہذیب سے اترنے نہ پائے کوئی بدہب اسی تعلیم کا مخالف نہ ہو گا۔ اگر نوانی حیا اور انسانی اخلاق کے اصول سلسلہ کا پورا احترام کیا جائے۔

عورتوں کے مدارس میں ان کی دماغی تربیت کے ساتھ ان کی جسمانی صحت کا بھی معقول انتظام ہونا چاہئے۔ اس لئے مدارس کے ساتھ کھیل کے میدان اور باغ بھی مہیا ہونے چاہئیں تاکہ ان کی فضا میں امیر و غریب ہمہ قسم کی بچیوں کی صحت درست رہ سکے۔

ترقی تعلیم اور پبلک کی طرف سے مساعی

میں نے ہندوستان کے تعلیمی مسائل کا ذکر کرتے وقت یہ کہنا تھا کہ میری کوشش ہوگی کہ بتاؤں کہ پبلک تعلیمی کاموں میں کیا دلچسپی لے سکتی ہے اور کس طرح حکومت کا ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ اپنی تقریر اسی بحث پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ حکومت کی شائع کردہ اطلاعوں (مثلاً رپورٹ اے نظم و نسق وغیرہ) سے عوام کو معلوم ہو سکتا ہے کہ سرکار کی جانب سے اخراجات تعلیم پر کتنا روپیہ سالانہ خرچ کیا جاتا ہے اور کیا تجاویز حکومت کے زیر غور رہتے ہیں۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں جبکہ انڈین سائنس کانگریس کا اجلاس حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا پروفیسر میگناتھ سائیکس کی خواہش پر میں نے حیدرآباد کے عنوان سے سائنس اینڈ کلچر (Science and Culture) کی اس ماہ کی اشاعت میں ایک مختصر مضمون شائع کیا تھا جس میں ریاست کی تاریخی جزائی مالی و دیگر انتظامی حالات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اور خصوصیت کے ساتھ بتایا گیا تھا کہ ملک میں تعلیم کس سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے۔ ابتدائی ثانوی، فنی نوانی اور اعلیٰ تعلیم وغیرہ پر کیا صرف ہو رہا ہے اور تعلیم کے متعلق حکومت کا نصب العین کیا ہے اس رپورٹ کے ذریعہ ملک کی بیداری اور اعلیٰ انخصوص دور عثمانی کے برکات کا علم ہندوستان کے ممتاز تعلیم یافتہ حلقوں میں سراپا لگ گیا۔ اس خاص ماہ کا نمبر اب بھی رسالہ کے آفس سے

جو حکومت میں واقع ہے دستیاب ہو سکتا ہے اس اشاعت کی وجہ سے میں نے اپنے موجودہ خطبہ میں ان امور کو دہرانا نہیں چاہا جن پر رپورٹ مذکور میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

حکومت کی طرف سے تعلیم کی جانب جو توجہ کی جا رہی ہے اس کے مقابلہ میں پبلک کا اس کام میں حصہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جاگیردار کا 'لج' محبوب کا 'لج'، مدرسہ نظامیہ، مدرسہ ملیہ قادریہ، مدرسہ مقید الانام، دیویکٹ روہنی اور بلدہ اور اضلاع کے چند امدادی مدارس وغیرہ جن کے چلانے میں سرکاری امداد کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے عوام کی تعلیمی مساعی کا بہترین نمونہ تصور کئے جاسکتے ہیں۔ میں مدرسہ اعزہ، مدرسہ آصفیہ، مدرسہ اسلامیہ سکندر آباد، مدرسہ ملیہ قادریہ ملک پیٹھ، وغیرہ کی محاسن انتظامی کے رکن کی حیثیت سے ان کے کاروبار اور ترقی رفتار سے بخوبی واقف ہوں اور بخوشی کہہ سکتا ہوں کہ یہ ادارے ملک کی خدمت میں اپنی بساط کے موافق بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر کوشش کر رہے ہیں امید کی جاتی ہے کہ امرا و متمول بزرگان ملک امدادی مدارس میں مزید دلچسپی لیں گے اور کم از کم ان کے کتب خانوں، آلات سائنس اور کھیل کے سامان وغیرہ کے اخراجات کا بار ہلکا کر کے اپنی فیاضی کا ثبوت دیں گے۔

معمراً شخص کی تعلیم کا مسئلہ بھی تمدن ممالک کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میری رائے میں اس مسئلہ کا بہترین حل مناسب کتب خانوں کا قیام ہے، جنہیں روزانہ یا ہفتہ واری اخبارات کے علاوہ دور حاضر کی کلچرل کتابیں بھی خریدی جانی چاہیں جو جامعیت و صحت بیاں اور ارزانی قیمت کے لحاظ سے عصر جدید کی بہترین پیداوار سمجھی جاسکتی ہیں۔ یہ زمانہ عشق و عاشقی ہنرمند مکاروں اور تعلیم یافتہ چوروں کے قصے پڑھ کر دل بھلانے کا نہیں ہے۔ اور اس لئے بہت لوگ آجکل ایسی کتابوں کے لکھنے کی زحمت ہی نہیں اٹھاتے۔ سائنس اور فلسفہ جواب تک ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہوتے سمجھا جاتا تھا کہ جہاں ایک علم ختم ہوتا ہے وہاں سے دوسرا شروع ہوتا ہے، حالیہ تجربی و مشاہداتی معلومات کی روشنی میں ایک دوسرے کے ساتھ پہلو پہلو چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا عجب کہ آئندہ پچیس سال میں یہ باہم دیگر مربوط ہو جائیں گے۔ اندنوں مشاہیر عالم ہی نوع کی کتابوں پر اپنے دماغی قوسے صرف کر رہے ہیں۔ تاریخ جو پہلے ہی ایک قوم یا ملک کی شان و شوکت کا نقارہ چہینے کے لئے لکھی جاتی تھی اب انصاف کی کوشاں اور حقیقت کی منلاشی نظر آ رہی ہے۔ جنگجو اور جنگ پسند ممبروں کے افراطی تجاویز کو توڑ کر اقوام عالم کے دلوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لئے سائنس اور فلسفہ کے اساسی کلیات سے مدد لی جا رہی ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ عوام ایسے سنجیدہ خیالات سے متاثر ہو کر اپنے اخلاقی زور سے دنیا کو اس تباہی سے بچالیں گے جو سائنس ہی کے خالص فنی اور مقصد اپہ منی مستخرجات کے غلط استعمال سے پھیلتی جا رہی ہے۔ مختلف اقوام کو ایک دوسرے سے مانوس و متحد بنانے کے لئے ایسی کتابوں کے مطالعہ سے

سہل ترکوئی طریقہ نظر نہیں آتا۔ جہل اور بجا استعمال علم سے تہذیب و انسانیت کی شکست کی جو خطرناک تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آ رہی ہے عوام الناس کے صحیح علم حاصل کرنے ہی سے رفع ہو سکتی ہے اور اس کے لئے اچھی کتابیں ہی موثر ثابت ہو گئی۔ کارلائل (Carlyle) کا مشہور مقولہ کہ کتب خانے ہی دنیا کی سب سے بڑی اور حقیقی جامعات ہیں جیسا اس زمانہ کے لئے صحیح ثابت ہو رہا ہے ویسا کبھی نہیں ثابت ہوا تھا۔ توقع کی جا رہی ہے کہ ریاست حیدرآباد کا سب سے بڑا کتب خانہ یعنی کتب خانہ آصفیہ اپنے دیرینہ روایات پر قائم رہ کر عوام کی ایسی ہی رہبری کرے گا۔ مناسب ہو گا کہ اضلاع میں بھی اس نوع کے کتب خانے کھولے جائیں جن کی قبل ازیں تو ضلع کی جاچکی ہے تاکہ فرقہ دارانہ لٹریچر سے لوگ بچھا چھڑائیں اور اتحاد کا سبق سکھانے والی کتابوں کے مطالعہ سے فائدہ اٹھائیں۔ میری رائے میں پبلک کے چندوں سے ایسے کتب خانے قائم کرنا مناسب ہو گا۔ سرکار عالی بھی ممکن ہے کہ اس کار خیر میں کچھ مدد دیگی۔

پبلک کی امداد نہ صرف معمر اشخاص کی عام تعلیم کے لئے کارآمد ہو سکتی ہے بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ کے تحقیقاتی کام بھی انجام پاسکتے ہیں۔ کلکتہ کی انڈین ایسوسی ایشن فار کلچرل ڈیولپمنٹ آف سائنس The Indian Association

for Cultivation of Science. ایک غیر سرکاری ادارہ ہے جس کا قیام ہندوستان کیسے تجزیہ

تحقیقات کا تنگ بنیاد ثابت ہوا۔ اس کے وجود سے پہلے سرکاری کالجوں وغیرہ کے تجربہ خاؤں میں جامعات کے امتحانوں کی حد سے آگے تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ تحقیقاتی کاموں کے لئے ان میں آلات سائنس اور ضروری سازوسامان فراہم کرنا کی استطاعت نہ تھی اس لئے مہمان قوم نے ایک تشفی بخش رقم جمع کی اور اس کے منافع سے ہونہار محققین کو ان کے خاص خاص مسائل حل کرنے کا موقعہ عطا کیا۔ یہ ادارہ چند ہی سال میں نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ چنانچہ ہندوستانی محققین کے سب سے پہلے جو ہندوستانی کام علمی دنیا کے سامنے پیش کئے گئے۔ اسی ادارے میں انجام پانے کے بعد اس کے رسالے میں چھپ کر شائع ہوئے۔ اگر ملک کے بلند ہمت ارباب چاہیں تو ایسا ایک ادارہ حیدرآباد میں بھی قائم ہو سکتا ہے اس میں وہ لوگ اطمینان کے ساتھ کام کر سکیں گے جن کا تعلق بدقسمتی سے حکومت کے کسی کلیہ یا رصد گاہ سے نہیں ہے لیکن جن کا علمی انہماک اور جذبہ تحقیق انکو بیکار رہنے نہیں دیتا۔ میں نہایت خوشی سے قطعاً بلا معاوضہ ایسے ادارہ میں ہونہار کام کرنے والوں کی رہنمائی کے لئے تیار ہوں۔ سائنٹیفک تحقیق تجربہ خانہ اور رصد گاہ بغیر ہو نہیں سکتی ورنہ اب تک بہت کچھ ہو گیا ہوتا۔

ادارہ ادبیات اردو جس کے ایڈیٹر و رفقاء زیادہ تر میر و بھٹی زمانہ صدارت کلید جامعہ عثمانیہ کے بہترین طالب علم تھے اور اب اپنی علمی قابلیت، تصنیفات و تالیفات کی بدولت ہندوستان بھر میں شہرت پا چکے ہیں اپنی ہی جماعت کے

سرمایہ اور تھوڑی سی بیرونی امداد کے ساتھ نہایت کامیابی کے ساتھ ملک کے ادبی خدمات انجام دے رہا ہے جیسا کہ اسکی مطبوعات کے ملاحظہ سے واضح ہوگا۔ اگر ارباب ہمت و اسی کوشش کریں تو سائنٹیفک تحقیقات میں بھی حیدرآباد جلد بازی لے جاسکیگا۔ مصروف عمل دماغ کو مل طلب مسائل کی کمی نہیں اور آزمودہ ہمت اور دیرینہ تجربہ جب اطمینان کے ساتھ کسی کام پر لگ جاتے ہیں تو ان کی کوششیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔

آخر میں ہمارے آقائے ولی نعمت حضرت سلطان العلوم ہزار گز الٹیدائش دی نظام آف حیدرآباد اپنڈ برار **نواب میر عثمان علیخان بہادر** غلہ اللہ ملکہ و سلطنت کے عہد و اقبال کی ترقی کے لئے دعا گو تا ہوں جن کے سایہ عاطفت میں ہر مذہب و ملت کے لکھو کھا بندگان خدا نہ طرف امن و امان کی زندگی بسر کر رہے ہیں بلکہ ہر طرح کے آرام و آسائش سے بھی مستغنی ہو رہے ہیں۔ حضرت بندگان عالی کے مبارک دور سلطنت میں علم و حکمت کو جو فروغ ہوا ہے اور رفاہ عام کے جو کام انجام پا رہے ہیں ان کی مثال شاید ہی کہیں مل سکیگی۔ اللہ تعالیٰ حضرت ظل اللہ کو ہر عزم میں کامیاب اور ہر میدان عمل میں فہمید کرے۔ شاہزادگان بلند اقبال اور خاندان شاہی کے جلد ارکین کو خوش و خرم رکھے اور ہماری آنے والی نسلوں کو خاندان آصفی کے وفادار خدمت گزار رہنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

خطبہ صدارت کے ختم ہونے پر سکرٹری نے جو روئداد سنائی وہ حسب ذیل ہے۔

روئداد

خیزندید کہ ہنگام صبح و گز آمد شب رفت و ز مشرق علم صبح بر آمد
نزدیک خروس از پئے بیداری تاں در بستی کہ پیغام نسیم سر آمد

جناب صدر و مہمان ملک و ملت۔

آج زائدا (۸) سال کے وقفہ یعنی ۷ و ۸ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ کے بعد حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا گیارہواں اجلاس اس مبارک و محبوب ٹون ہال میں منعقد ہو رہا ہے جہاں اس کی سب سے پہلی تقریب اسی کانفرنس کے پہلے اجلاس کو منعقد کر کے منائی گئی تھی۔

اس مبارک ہال میں ہمارا آٹھویں مرتبہ جمع ہونا خبر دے رہا ہے کہ کانفرنس اپنے اندر پراثر قوت روح رکھتی ہے۔ کانفرنس کی پہلی اپریل ۳۳ جمادی الثانی ۱۳۳۹ھ کو شروع ہوئی تھی اس نے اب ۲۵ سال کی عمر حاصل کر لی ہے اب اس کا تیسرا دور آغاز ہوا ہے دعا ہے کہ اللہ جل شانہ کے فضل و کرم سے اپنے دور اول کی طرح قوم و ملک کی صلاح و فلاح میں

مؤثر ہو گزشتہ سال میں ہمارے دوبرہنہ کا مولوی عبدالسلام مرحوم مولوی نظیر حسین فاروقی مولانا عبدالواسع مرحوم آنجنابی راجہ جگموہن ٹال۔ مولوی احمد محی الدین مرحوم۔ آنجنابی داس ناٹک۔ آنجنابی پنڈت کیشو راؤ نواب محمد نواز جنگ مرحوم جن کا ایثار و انہماک کے ساتھ اس کانفرنس کی نشوونما اور صلاح و فلاح ملک میں حصہ لینا کبھی فراموش نہ ہونا چاہئے۔ نیز نواب لطف الدولہ مرحوم نواب لطیف یار جنگ مرحوم محمد عبد المجتبار مرحوم جاگیر دار ارکان دوامی۔ نواب فخر الملک مرحوم نواب دلی الدولہ مرحوم سرسود جنگ مرحوم جو کار فرمایاں سررشتہ تعلیمات تھے دائمی طور پر ہم سے جدا ہو گئے اور مجو خواب عدم ہیں۔

بعض رفقاء نے کار کی مدد اب ہمارے ساتھ نہیں رہی ہے بعض کا حیدر آباد سے تعلق منقطع ہو گیا ہے۔ جن میں سٹرکوجی پرنسپل انجینئرنگ اسکول کا نام خصوصیت کے ساتھ ان کے بے لوث اور بلا تفریق قوم و ملت خدمات کانفرنس کیسے دیا جاسکتا ہے۔

بعض رفیق خدمات ملک یا کم خدمت کانفرنس سے تھک گئے ہیں۔ ہمارے (۴) سرگرم رہنمایاں عمل صدر نشیناں کانفرنس و مجلس استقبالی کانفرنس اپنے بلند خدمات ملک اور ممتاز وجاہت کی بدولت مراتب عالیہ حکومت کی بلند ذمہ داریوں پر پہنچ گئے ہیں اب بھی ان کی اعانت و ہمدردی ہمارے ساتھ شامل ہے۔

جن طرح عالم کون و فساد کا دستور ہے جدا شدہ رفقاء نے کار کی جگہ نوجوان نسل کے بلند حوصلہ افراد لئے بستے ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو کانفرنس کے پہلے یا بعد کے اجلاسوں میں رضا کارانہ ہمارا ہاتھ بٹا رہے تھے یا طالب علم کی حیثیت میں کانفرنس کے اجلاس میں پبلک لائف اور ملک کی تعلیمی خدمات کا مطالعہ کر رہے تھے اور اب محنت و کوشش و ہمت سے بلند مراتب تک پہنچ گئے ہیں۔

آپ کے اولین آزریری سکریٹری مولانا محمد مرتضیٰ مرحوم اور ان کے رفقاء نے کار نے برٹش انڈیا کے قومی و ملکی تحریکوں اور اپنے ملک و ملت کے ترقی کے وسائل و ذرائع پر اپنے طالب علمی میں انہماک کے ساتھ غور و خوص کیا کہ کس تحریک پر قوت عمل صرف کی جائے۔ مدرسہ۔ بورڈنگ معاشرتی اصلاح۔ سیاسی تحریکات۔ معاشرتی کاروبار مخفق قوم تحریکات پر جو برٹش انڈیا میں عموماً ہر جگہ جاری ہیں نظر ڈالی گئی مگر بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس مبارک قلمزدیں جہاں ہم خود اپنی حکومت رکھتے ہیں اور جہاں حکومت و رعایا کا نصب العین ایک ہے۔ اور جہاں حکومت کا اولین اصول یہ ہے کہ رعایا کے فائدہ کے لئے حکومت کی جائے یا بالفاظ حضرت غفران مکان علیہ الرحمہ۔

آصف کو جان مال سے اپنے نہیں دریغ گر کام آئے خلق کی راحت کی واسطے

جہاں رعایا کی مفید تحریکات اور اداروں پر مصارف کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا اور جہاں مختلف اقوام و مل کا اتحاد تمام ہندوستان کے لئے ایک نمایاں اور قابل تقلید نمونہ تھا اور رہنا چاہئے۔ جہاں خود سرکار ری تعلیمی ادارے کثرت سے موجود ہیں۔ ملک در رعایا کی صلاح و فلاح کے لئے خدمتِ اولین ہی ہے کہ حکومت اور رعایا کے تعاون و تشارک سے توسیع و اصلاح تعلیم کے لئے ملک کی فوٹین کیا کی جائیں وسعت تعلیم اور صحیح اصول کی تعلیم متقبل کو خود بخود درست کر دے گی اور بالآخر انہوں نے حیدر آباد اتھو کیشنل کانفرنس کو اپنی راہ عمل بنالیا۔

پچیس سال قبل کانفرنس کے قیام کی پہلی اپیل جو شائع کی گئی تھی اس میں دردِ دل کو الفاظ کا رنگ اس طرح دیا گیا تھا۔ ”محبانِ وطن اگر دنیا کی موجودہ حالت سن کر ہمارے دل میں بھی کچھ احساس پیدا ہوتا ہے اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں ہمارا نام عزت سے لیں اگر کچھ بھی رقی حیات ہم میں باقی ہے تو اٹھو اور ثابت کرو کہ ادا کہ ہم بھی چاہتے ہیں کہ حیدر آباد اسی طرح علمی دنیا کا سر تاج بن جائے۔ جس طرح بغداد و قرطبہ کا نام آج بھی دلِ حسرت پرست کی زبان سے نکل جاتا ہے۔ قدرت کا فیصلہ ہے جو قوم اپنی زندگی کی فکر نہ کرے اس کی موت لازمی ہے

سنبھلو وگرنہ رہنایاں اس طرح ہوگا

بھیل اور گونڈ جیسے کم نام و بے نشان ہیں“

اس اپیل میں کانفرنس کے یہ تین اصولی مقصد قرار دئے گئے تھے۔

(۱) علمی سوسائٹی کا قیام

(۲) توسیع دائرہ تعلیم

(۳) اصلاحِ تعلیم

آخری مقصد کے متعلق اجمالی نظامِ عمل بھی پیش کر دیا گیا تھا کہ

الف۔ علوم و فنون اردو میں لائے جائیں۔

ب۔ عام مرد و ہر زبان اردو کو اعلیٰ اور فوقانی تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے۔

ج۔ یونیورسٹی کا قیام۔ اس کے لئے پچیس سال پہلے یہ الفاظ لکھے گئے تھے

”کانفرنس کو یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جبکہ نظامِ یونیورسٹی عملاً ہمارے

نوجوانوں کی زندگی کا محور بنے“

ان سب سے بڑھ کر یہ تخیل تھا کہ علوم و فنون اور اصول تعلیم مشرق و مغرب کو اس طرح امتزاج دیا جائے کہ ہماری

قدیم شائستگی، تہذیب، روایات کچھ و مذہب کی روح فنا نہ ہونے پائے۔

۲۵ سال پہلے خادماں ملک کا یہ بلند تخیل استعجاب سے دیکھا جاتا تھا اور خاص کر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا اور ملک میں اپنی یونیورسٹی قائم کرنا اکثر ماہران تعلیم کے پاس غیر معینہ اور غیر ممکن عمل تخیل سمجھا جاتا تھا۔

غلوں مل کی وجہ چند ماہ ہی میں کانفرنس کو ہڑکسنی رائٹ انٹیل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر بالقابہ کی رہنمائی دوسرے پرستی حاصل ہو گئی جو اس وقت متعدد تعلیمات تھے۔ ۲۷ فروردی ۱۳۲۴ء کو کانفرنس کا پہلا جلسہ اسی ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی تاثیر دلوں پر اپنے بچے جذبات اور ولولہ خیزی کے لحاظ سے کبھی نہ زائل ہوگی۔ اس کے بعد پانچ اجلاس ہوئے اور کانفرنس کا نام اور کام روز بروز قوت حاصل کرنے لگا۔ اجلاس پر رہتی کے بعد جو مشکلات پیدا ہوئیں اسکو رفع کرنے میں چھ سال مرحوم معتمد صاحب اور مجلس انتظامی کو صرف کرنے پڑے۔ ۲۵ مئی ساٹواں اجلاس مولانا محمد رفیعی مرحوم کے انتقال سے چند روز پہلے بصدارت نواب مرزا یار جنگ بہادر اسی ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے تاثرات بھی تازہ ہیں۔

مولانا محمد رفیعی مرحوم کے بعد جناب مولوی سید خورشید علی صاحب معتمد کانفرنس قرار پائے۔ ۳۰ مئی تک ان کی معتمدی میں کانفرنس کے عین اجلاس حیدر آباد میں منعقد ہوئے اور تقسیم وظائف کا کام جاری رہا۔ اگرچہ یہ تذکرہ تکلیف دہ ہے لیکن ناگزیر ہے کہ اس کے بعد ۸ سال کا طویل عرصہ بغیر کسی عام اجلاس کانفرنس کے گزر گیا۔ صرف مجلس وظائف کبھی کبھی طلب ہوتی تھی۔ مجلس انتظامی اور مجلس منتخبہ تک کے اجلاس رک گئے۔

اس ۸ سالہ عرصہ میں کانفرنس کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی ملک میں وسعت تعلیم اور ماحول کی وجہ جو بیداری پیدا ہو گئی ہے اس کے نتیجہ کے طور پر اجتماعی تحریکیں ناگزیر ہیں اور ایسی تحریکوں کا صحیح راستہ سے لے چلنا کانفرنس کا مقصود تھا۔ حیدر آباد یوپی کونسل کانفرنس کی خاموشی سے ملک میں مختلف تعلیمی اور معاشرتی کانفرنسیں اور انجمنیں اور دوسری قسم کی تحریکیں پیدا ہو گئیں ہیں۔

کانفرنس کی طویل خاموشی پر چند ہمدرد ارکان مجلس انتظامی کی جن کی ہمدردی اور اخلاص مل کی کانفرنس نفاذ کارسزمین منت ہے، توجہ مبذول ہوئی اور بتاریخ ۱۲/۱۱/۱۳۲۴ء صدر مجلس انتظامی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں حسب زریعہ یوشن اجلاس دہم بابہ ۱۳۲۴ء جس کی تفسیل کا موقع نہ آیا تھا۔ جناب مولوی محمد عبدالرحمان خاں صاحب مجلس انتظامی کے ممبر جس قرار پائے۔ جو ابتداء سے کانفرنس کے ہمدرد و مدد و معاون و رکن مجلس انتظامی رہے ہیں۔ اور حیدر آباد کی تعلیمی ترقی اور تعلیمی اصلاح میں جناب مدد و کام کا نام اور کام تعلیمی حلقوں کو یاد ہے۔

مجلس انتظامی نے اس اجلاس میں یہ تصفیہ کیا کہ حسابات کانفرنس کی حسب ضابطہ نتیجہ عمل میں آئے۔ اور جلد تر اجلاس عام کانفرنس منعقد کیا جائے۔ تیج حسابات کے لئے دو اراکین کانفرنس مقرر کئے گئے اس کے نتیجہ کو طور پر ۱۱ اراکین اور ۱۳۴۶ مفید مجلس منتخبہ منعقد ہوئی اور اس مجلس میں جناب مولوی سید غور شید علی صاحب نے بذریعہ تحریک کانفرنس کی ذمہ داریوں سے بجز قومات سلک کی ذمہ داری کے خود کو سبکدوش کر لینے کی اطلاع دی مجلس انتظامی نے ارادہ کیا ہے کہ (۸) سال کے عرصہ میں کانفرنس کو اسکی غاوشی سے جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی تیز رفتاری اور بہت سے کی جائے اور جو امانت ملک و قوم نے کانفرنس کی صورت میں اس کے سپرد کی ہے اس کی حفاظت کی جائے۔

جناب مولوی سید غور شید علی صاحب کے مستغنی ہو جانے کی وجہ مجلس انتظامی نے معتدی کانفرنس کی اہم ذمہ داری اس ناچیز کے سپرد کی ہے اور مولوی محمد غوث صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ شریک معتد بناؤ گئے ہیں۔

محبان ملک سکرٹری کافرینہ ہے کہ گزشتہ سالوں کی روداد سنائے۔ آپ کی مجلس انتظامی کو یہ مسائل کا اعتراف ہے کہ ۸ تریز ۱۳۴۶ کے بعد سے بجز اس کے کہ تعمیر وظائف کا کام جاری رہا۔ اور کوئی کام شہد ف تک نہ ہو سکا ۱۳۴۶ سے مجلس انتظامی نے دردمندانہ احساس فرائض کے ساتھ تجدید کانفرنس کی کوشش شروع کی اور اس کا نتیجہ آپ کا یہ اجتماع ہے۔

اسمندیہ کہ اب کانفرنس کا متوی شدہ کام پھر شروع ہو چکا ہے۔ مجلس انتظامی میں ہمدرد ملک اور مستعد اراکان شامل کئے گئے ہیں جن کی فہرست اس رپورٹ کے ساتھ منسلک کی گئی ہے اگر ملک کی تائید ہمارے ساتھ شامل رہے تو انشاء اللہ کانفرنس میں وہی روح پیدا ہو جائے گی جو پہلے تھی۔

کانفرنس کا پچیس سالہ کام ملک کے سامنے موجود ہے۔ کانفرنس جب اپنے بلند اور ہمہ گیر مقاصد کے ساتھ قائم ہوئی تو اولین سوال جو پیش نظر ہوا یہ تھا کہ دائرہ عمل کیا ہو۔

آپ کے اولین معتد مولانا محمد رفیع مرحوم کی دلی خواہش تھی کہ تحقیقات علمی کے کام کو اہمیت دیجائے اور وہ خود اس میں سنبھک ہونا چاہتے تھے۔ لیکن اپنے عہدیم الفرصت ہونے کانفرنس کی محدود آمدنی اور دوسرے کاروبار کانفرنس کی وجہ اس کے طرف متوجہ نہ ہو سکے اگرچہ کچھ محدود کام ان کے زمانہ میں بھی ہوا۔ لیکن علامہ سرکار عالی کے سررشتہ تالیف و ترجمہ نے اس کام کو شروع کر دیا اور جامعہ عثمانیہ کی کامیابی نے مختلف علمی سوسائٹیاں ملک میں جا بجا قائم کر دی ہیں۔ جن میں ادارہ ادبیات اردو کا نام خوشی اور اہمیت کے ساتھ لیا جاسکتا ہے اور اس کے کام کا اندازہ اس نمائش سے ہو سکیگا جو کانفرنس کے ساتھ ہو رہی ہے۔ دائرۃ المعارف کا ۱۲۰۰ فہرست آخر میں بطور ضمیمہ اول شامل ہے ۱۲

کام بھی اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ انجمن ترقی اردو کا نفرنس کے پہلے سے کام کر رہی ہے۔ یہ خیال پیش نظر ہے کہ اس کام میں کانفرنس بھی قدم بڑھائے۔ اگر کانفرنس کو ملک کی جانب سے مع قبول حاصل ہو جائے تو انشاء اللہ استعان جلد تر کچھ نہ کچھ کام اس سلسلہ میں آغاز کر دیا جائے گا۔

کانفرنس نے سب سے زیادہ اہمیت اپنے قیرے مقصد اصلاح تعلیم کو دی۔ یہ ظاہر ہے کہ آج ہندوستان میں ہر جگہ موجود تعلیم کے نقائص پر غور ہو رہا ہے۔ وردھا اکیم و دیاسندر اکیم اسی غور کے نتائج ہیں۔ جن چیزوں پر آج غور ہو رہا ہے ان پر حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس نے پچیس سال پہلے غور شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان کے مہول تعلیم وغیرہ میں تبدیلی بکثرت مشکلات اور چھپیدگیوں کو لئے ہوئے ہے۔ یہ دشواریاں اور چھپیدگیاں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ ملک اور ہماری حکومت میں نہیں ہیں۔ سرکار عالی سررشتہ تعلیمات کو ملک کے بہترین مفاد کے ساتھ چلانا چاہتی ہے اور جو تحریکات رعایا کی جانب سے ماہران تعلیم کے کامل غور و غوض کے بعد پیش ہوں ان پر جہاں تک ممکن ہو عمل پیرائی میں کوئی تاثر نہیں کیا جاتا ہو اور یہی وجہ تھی کہ ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے مقاصد سہ گانہ میں اصلاح تعلیم کے مقصد کو خاص اہمیت دی۔ اس کے چند ارکان سائل تعلیمی تفصیل اور انہماک کے ساتھ خور کرتے اور رد و لیوشن کے صورت میں تجاویز مرتب ہو کر بحکمت کیٹی اور مجلس انتظامی میں جن میں افسران سررشتہ تعلیمات بھی شامل ہوتے تھے مزید غور و غوض کیا جاتا۔ یا تو مسودہ منظور ہو جاتا یا ترمیم ہوتی یا مسترد کیا جاتا۔ منظور یا مرمہ رد و لیوشن اجلاس کانفرنس میں پیش ہوتے اور بعد غور و بحث منظور ہوتے اور اس کو معتمدی متعلقہ میں توجہ کے لئے روانہ کر دیا جاتا اس میں ایسی تحریکات بھی تھیں جو کانفرنس کے جانب سے ابتدا میں پیش ہوئیں اور ایسے انکو بھی توجہ دلائی گئی جو سررشتہ تعلیمات کے زیر غور تھے تاکہ ان کے نفاذ میں ملک کی رائے کا رجحان ظاہر ہو جائے۔ اس رپورٹ کے ساتھ ایک ضمیمہ منسلک کیا جاتا ہے جس سے واضح ہو گا کہ کس قدر تحریکات کو سرکار عالی نے مع قبول عطا فرمایا۔ جو تحریکات ہنوز معروض قبول میں نہیں آئی ہیں ان کی نسبت اس کانفرنس میں جدید رد و لیوشن پیش ہوں گے۔

کانفرنس نے (۲۵) سال پہلے جو اصلاحی پروگرام تعلیم پیش کیا وہ کل کا کل آج سرکار عالی کے سلسلہ پروگرام تعلیم میں داخل ہے۔ ہمارے ملک میں خود ہماری اپنی مصلحت اور خود اختیار جامعہ عثمانیہ تمام ہندوستان میں شہرت و امتیاز کو لئے ہوئے قائم ہے اس کے تحت دارالترجمہ علوم و فنون کو اردو کا لباس پہنا رہا ہے۔ ذریعہ تعلیم علوم و فنون نہ صرف فوقانی مدارس میں بلکہ آرٹس کالجوں اور فنی کالجوں میں کسی اجنبی زبان کو نہیں بلکہ اپنے ہی ملک کی سرکاری زبان اور نہ صرف دکن بلکہ تمام ہندوستان کی عام مروج زبان اردو کو بنایا گیا ہے ۱۹۵۱ء سال پہلے یہ تحیل تھا اور ممکن ہے

کہ یہ نخل دوسرے دماغوں میں بھی ہو لیکن ان کی صدا سب سے پہلے بانیانِ کانفرنس نے ہی اولا کانفرنس سے باہر جبکہ کانفرنس قائم نہ ہوئی تھی اور پھر کانفرنس کے ذریعہ بلند کی۔ سررشتہ تعلیمات کے پیش نظر اب تعلیمی اصلاح کی جو اسکیم ہے اس میں جبری تعلیم تو وسیع تعلیم ابتدائی ثانوی تعلیم میں ضروریاتِ سوانیت کا لحاظ رکھنے۔ دینی تعلیم اور شہری تعلیم میں ہر ایک کی ضروریات کو ملحوظ رکھنے پیشہ اور فنون کی تعلیم کو دست سے رائج کر کے تعلیم میں ملک کے کلچر کو ملحوظ رکھنے کی تجاویز شامل ہیں یہ سب ایسے امور ہیں جن پر کانفرنس کے اجلاسوں میں بار بار اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

کانفرنس کے دوسرے مقصد تو وسیع تعلیم میں کانفرنس کے ابتدائی اجلاس بالواسطہ تحریکوں و ترغیب کا باعث ہو گا مگر پہلے اجلاس میں جناب نواب سرحد نواز جنگ بہادر کے خطبہ مانے صدارت و اختتام خاص اثر رکھتے تھے۔ کانفرنس نے اعلیٰ اور ثانوی تعلیم کے لئے پہلے اجلاس سے وظائف کا سلسلہ قائم کیا۔

چھٹے اجلاس پر مبنی کی رپورٹ میں ظاہر کیا گیا تھا کہ اس وقت تقریباً تیس ہزار روپیہ سے تقریباً دو سو غیر مستطیع طلبہ کو مدد پہنچائی گئی۔ اس کے چھ سال بعد جو اجلاس کانفرنس ہو اس میں ظاہر کیا گیا کہ:-

”مجھ بتیہ اس پانچ سال کے طویل اور پُر از سرخ و من دور میں بھی ہمارا یہ کام بدستور اخلاص و ہمدردی کے ساتھ جاری رہا گو اس میں جس قدر دشواری پیش آتی رہی اس کی سختی کام کرنے والوں کے دل ہی جانتے ہیں سالانہ اجلاسوں کی آمدنی بند ہو گئی وظائف جو جاری ہو چکے تھے وہ بند نہیں ہو سکتے تھے۔ تین چار سو روپیہ کا ہر مہینہ میں فراہم کرنا ایک دگدگانِ فرض و ذنگ کی تھا ایک دفعہ تو شدید ترین شکل پیش آئی اور ذریعہ چندہ فراہمی رسم کی کوشش کی گئی لیکن رقم بہ قدر ضرورت نہ ملتی تھی اور بڑی دشواری کے ساتھ قرضہ سے کام چلانا پڑتا تھا بہر حال ان تمام شدائد و محن کے ساتھ کام جاری رہا بجز شدت آج تک کبھی یہ صورت پیش نہیں آئی کہ وظیفہ جاری کرنے کے بعد بند کرنے کی نوبت آئے ان تکالیف کے بعد یہ ٹرہ ہے کہ اس پانچ سال کے عرصہ میں (عسب) وظائف پر صرف کئے گئے۔ بروقت اجلاس بر مبنی ماہ دسے ۳۳ (۵۸)، طلبہ وظیفہ یاب کانفرنس تھے اس کے بعد پانچ سال میں ۴۶ طلبہ کو وظیفہ اجرا ہوا۔

عثمانیہ کالج کے افتتاح کے ساتھ وظائف طلبہ کیلئے کانفرنس نے ابتداء میں ماہانہ دو سو روپیہ کے حساب سے صرف کئے اور ابتدا میں سرکاری وظائف کی مقدار بھی اسی قدر تھی جو بعد میں کانفرنس کے وظائف کے اثر سے زیادہ ہو گئی۔ ابتدائی بی۔ اے کے کامیابان عثمانیہ یونیورسٹی میں رجب طلبہ وظیفہ یابان کانفرنس تھے۔ ان میں بہت سے طلبہ ایسے تھے جنہیں اسکول میں بھی وظیفہ جاری کیا گیا تھا اور سات آٹھ سال تک مسلسل انکو بلا ناغہ ماہ ماہ امداد پہنچائی جاتی رہی۔ جسکی بدولت وہ بی اے ہو سکے“

آخری اجلاس منعقدہ ۳۳ میں سرکڑی صاحب نے یہ ظاہر کیا تھا کہ ”پندرہ سال کی مدت میں ماہانہ وظائف امداد وغیرہ

کتب و فیس امتحان وغیرہ کے ذریعہ طلبہ کو مدرسے کی امداد دی گئی۔

اب اس سلسلہ میں خوشی کے ساتھ یہ عرض کیا جاتا ہے کہ ۲۳ سال کے عرصہ میں یعنی اردی بہشت ۱۳۵۷ھ تک ۲۹ طلبہ وظائف و امداد کتب و فیس امتحان میں بھیجے گئے کی امداد دی گئی اور یہ امداد ہر قسم کے کا بجی و فوقانی تعلیم کیلئے دی گئی ہے۔ اکثر طلبہ کو میٹرک سے بی۔ اے تک ذلیفہ دیا گیا ہے۔

سالانہ وظائف اور نتائج تعلیم و ذلیفہ یا بانٹ کے متعلق متعدد تحصیلات بجائے خود کا نفرنس کی خاموش حلیت کا بہترین ثبوت ہیں۔ جو وظائف کا نفرنس کے جانب سے دئے جاتے ہیں وہ بطور قرض حسنہ ہوتے ہیں کہ بعد فراغ تعلیم و حصول ذرائع معیشت اسکی باقسط ادائیگی کی جائے گی۔ یہ تاسف اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اسکی ادائیگی کے طرقتوجہ کم کی گئی ہے۔ تقریباً ۷۰۰۰ وصول طلبہ ہیں۔ اگر چھوٹی اقساط سے بھی رقم ادا ہوتی ہے تو مانہ چار پانچ سو روپیہ تک باسانی وصول ہو سکتا ہے اور اسلئے اسی مقدار میں بلا تفریق چندہ وظائف کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ بعض دفاتر سرکاری نے ایسے ذلیفہ یافتہ ملازم افراد سے رقم وصول کرنے میں قابل لشکر مدد فرمائی ہے۔ اس کے ساتھ ایسے غیور اور قابل فخر و ناز افراد بھی ہیں جنہوں نے کل قرض معیشت یا دو تین قسطوں میں ادا فرمائی اور کا نفرنس کیلئے انتہائی دلچسپی رکھتے ہیں۔ کا نفرنس کے (۲۵) سالہ آمد و خرچ کی تفصیل کے لئے ایک گوشوارہ اس رپورٹ کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔

کا نفرنس کی جھولی بڑی مدینک خالی ہو گئی ہے۔ ملک کے متعدد ہونہار مگر غریب طلبہ کی تعلیم کی راہ میں شدید مشکلات حاکم ہیں اور وہ کا نفرنس کی امداد کے لئے چشم بر راہ ہیں۔ سرمایہ محفوظ سے بہت تھوڑی آمدنی ہوتی ہے اور اراکین کی تعداد بھی اس سال زیادہ نہیں ہوئی ہے۔

بالفاظ ہزار گھنٹی نواب سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر

و حکم استقامت اور ہونہار طلبہ کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے ان ہی ٹکڑوں میں جو اب بھی ہوتے ہیں اور کیا معلوم کہ انہی سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو ہمارے ملک کیلئے باعث فخر ہوں اس لئے کہ انکی مدد کرنا اپنا ملک کی مدد کرنا ہے۔ کا نفرنس کے ثمرات تعلیم کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ضرورت ہے کہ دردمند این تعلیم کا نفرنس کے کیسہ خالی کو پر کر نیکی جانب توجہ عاجلانہ فرمائیں۔

آنا نکلہ خاک را بہ نظر کیا کنند آبا بود کہ گوشہ چشمتے بیا کنند

آخر میں ہم کو یہ عرض کرنا ہے کہ پچیس سال پہلے ہماری اہم ضرورت یہ تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو تعلیم کی ترقی جو اب مسلم کی ترقی جس زور سے ہو رہی ہے اسی قدر ہمارا کام اہم ہوتا جاتا ہے۔ تعلیم کی ترقی جدید مشکلات اور جدید مسائل کو پیدا ۱۵ یہ تفصیل بطور ضمیمہ سوم آخر میں شامل ہے ۱۶ یہ گوشوارہ بطور ضمیمہ چہارم آخر میں شامل ۱۷

کرتی جا رہی ہے۔ ہندوستان کا دور جدید ہمارے ملک کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ جس طرح بری کے سلاب کو نہروں آبادوں
 ناوں کے ذریعہ کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح تعلیمی سلاب کو مفید اور نتیجہ خیز رخ پر بہا نامزدی ہے۔ ہمارے
 اولیں صدر نشین ہرکسنی نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے اپنے خطبہ افتتاحی و افتتاحی میں جو بیخ فقرے ارشاد
 فرمائے تھے وہ آج بھی صادق آتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ:-

”جو قسمی درخواست میری یہ ہے کہ جہاں ہم اپنی ذات کے لئے اتنا کچھ کرتے ہیں وہاں ہم غور و سا کچھ اپنے ملک کیلئے
 بھی کریں۔ ہم دنیا میں تنہا نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ ہماری حالتیں اور ساری امیدیں اپنے ملک سے وابستہ ہیں۔
 ملک کی فلاح میں ہماری فلاح اور ملک کے نقصان میں ہمارا نقصان ہے اس لئے ہمیں کچھ ایثار سے بھی کام لینا چاہئے
 اگر ہم میں اپنے ملک کی کچھ محبت ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ان خوفناک آفتوں سے بچنے کے لئے جو جہالت سے پیدا
 ہوتی ہیں۔ غلوں و غریبوں اور جوش و صداقت سے کام لیں۔ جہالت کا مقابلہ کریں اور علم کا نور تمام ملک میں پھیلائیں
 ایثار و غلوں و غریبوں میں کہ جس قوم و ملک میں پیدا ہو گئیں انہیں کوئی قوت ترقی سے روک نہیں سکتی“

”اگر ہم نے اپنے ملک اور اپنے آقا کی کوئی خدمت نہ کی تو ہماری زندگی بالکل بیکار اور فضول ہے۔

ہر شخص کو جب وہ دنیا کے کھیرے سے فارغ ہو یہ سوچنا چاہئے کہ اس نے اپنے ملک کی کیا
 خدمت کی اور اگر اس سے کوئی خدمت نہ ہوئی ہو تو دعا مانگئے کہ خداوند تعالیٰ اسے اس قابل بنائے

بالغافا برادر محترم جو انہوں نے آخری اجلاس کانفرنس میں کہے ”جو عظیم الشان مقصد ہمارے پیش نظر ہے اس کیلئے
 بہت کچھ کرنا ہے سرکار کے مبارک ارادہ کی عملی صورت میں جلوہ گری کانفرنس کے عملی سہی و کوشش پر منحصر ہے۔ ضرورت ہے
 کہ تعلیمی سہی و کوشش کا ایک مضبوط سلسلہ قائم ہو اور ملک میں ایک باقاعدہ کام کرنے والی جامعیت قائم ہو جائے۔

کھیتوں کو دسے پانی اب بہہ ہی ہو گنگا کچھ کرو نو جوانو اٹھی جوانیاں ہیں۔

دعا ہے کہ زیر سایہ عظمت مدظلہم العالی ہمارا قدم زراعت ارادہ مضبوط عمل میں غلوں روز افزوں ہو۔ کانفرنس کو اپنے
 فرائض عمل کے بدولت دوام نصیب ہو اور قلد و آصفی میں جا بجا اسکے جسے تخت آصفی کے زیر سایہ مسلسل روز افزوں رونق اور
 کامیابی کے ساتھ اپنا شمار بڑھاتے جائیں“

اس رپورٹ کے اختتام پر پہلا اجلاس ختم ہوا۔ اور جناب صدر مآستانہ حیدر آباد کے جدید مطبوعات کی نمائش کا افتتاح فرمایا۔
 اس نمائش کا اہتمام ادارہ ادبیات اردو نے بہت سلیقہ سے کیا تھا اور عام طور سے اس کوشش کو بہت پسند کیا گیا۔

اجلاس دوم

دوسرا اجلاس ۲ بجے سے شروع ہوا۔ اولاً جناب صدر صاحب نے کانفرنس کی جانب سے صحابہ مندرجہ ذیل کے انتقال پر اظہار تعزیت کیا۔

- | | | |
|------------------------------------|----------------------------|------------------------------------|
| (۱) مولوی عبدالسلام مرحوم | (۲) مولانا عبدالواسع مرحوم | (۳) آنجنابی راجگ موہن لال |
| (۴) مولوی احمد محی الدین حین مرحوم | (۵) آل جہانی دامن نایک | (۶) آل جہانی پنڈت کیٹوراؤ |
| (۷) نواب لطیف یاجنگ مرحوم | (۸) نواب لطف الدولہ مرحوم | (۹) جمعدار عبد الجبار مرحوم |
| (۱۰) نواب فخر الملک مرحوم | (۱۱) نواب ولی الدولہ مرحوم | (۱۲) نواب مسو جگ سید اس مسود مرحوم |
| (۱۳) ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم | (۱۴) آنجنابی لارڈ روز فرڈ | (۱۵) آنجنابی جارج ایلری ہیل |

بعد ازاں تحریک نمبر ایک پیش ہوئی جو یہ ہے۔ ”اس کانفرنس کی رائے میں دینیات اور اخلاقیات کی تعلیم سے طلبہ کو زیادہ مانوس بنانے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ ان امتحانوں میں تشفی بخش تعداد میں کامیاب ہو سکیں۔“

مولوی محمد فیض الدین صاحب اذکیت نے یہ تحریک پیش فرمائی اور اس سلسلہ میں مختصر طور سے تقرر کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرات! میں آپ کی خدمت میں تحریک نمبر (۱) پیش کرتا ہوں جو حسب ذیل ہے۔

”اس کانفرنس کی رائے میں دینیات اور اخلاقیات کی تعلیم سے طلبہ کو زیادہ مانوس بنانے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ ان امتحانوں میں تشفی بخش تعداد میں کامیاب ہو سکیں۔“

اس تحریک کے آخری الفاظ تاکہ طلبہ ان امتحانوں میں تشفی بخش تعداد میں کامیاب ہوں وہ زائد اور اس تحریک کا ایک نتیجہ ہے صرف اس ضمن کیلئے یہ تحریک نہیں پیش کی جاتی ہے بلکہ اصلی غرض اس تحریک کی تیسے کہ ہماری تعلیم اخلاق و دینیات میں عام طور پر ایسی ہو کہ ہم اخلاق سے کماحقہ آراستہ اور مذہب کے پابند ہوں۔

انسان میں دو خوبیاں ایسی زبردست ہیں کہ اس کے برابر دوسری کوئی خوبی نہیں ایک خوبی خوبصورتی کی ہے اور

دوسری خوبی خوب سیرتی کی پہلی خوبی فطرتی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور دوسری خوبی اکتسابی ہے پہلی خوبی کسی شخص میں نہو اور کوئی شخص خوبصورت نہ ہو تو اس کا اپنا کوئی قصور نہیں ہے اور اس کی مجبوری کے باعث کسی بد صورت شخص کو کوئی بُرا نہیں کہتا اور نہ اس کے اس عیب پر نظر کرتا ہے لیکن جب کسی شخص میں دوسری خوبی اور خوب سیرتی اور خوش اخلاقی کی نہ ہو تو پھر ایک بہت بُرا عیب سمجھا جاتا ہے۔ اور ایسے شخص سے جو خوش متعلق نہو کوئی شخص ملنے کو بھی دل سے پسند نہیں کرتا اسلئے ہر انسان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے کو زیور اخلاق پر آراستہ کرے۔

ہمارے اخلاق اور ہمارے شامل آج کل بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ نوجوان طبقہ سینما میں کی طرف مائل ہے اور سینما جقدر مخرب اخلاق ہے اس سے اکثر دیگر اقسام واقف ہیں لیکن اس سے اجتناب نہیں کیا جاتا۔ یورپ کے سینما کی ابتدا ہوئی ہے اور یورپ کے علوم و فنون کی آج چار دانگ عالم میں تقلید کی جا رہی ہے اور اس کے اخلاق میں بھی پیردی کی جا رہی لیکن اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے اور وہ سینما کو بہت برا اور مخرب اخلاق سمجھ رہا ہے اور یورپ ہی کے مجدد اور عقلا اس کے برائیوں سے تنگ آکر اس کے اسناد کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں

پس اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اس کا اسناد کریں اور اپنے ملک میں ایسی تسلیم دیں اور ایسے اخلاق پیدا کریں جس سے آدمی بابتہ مذہب اور خوش اخلاق ہو اس تحریک سے متعلق میں آپ کے سامنے بہت کہنا چاہتا تھا لیکن وقت کم ہے اور جناب صدر صاحب کا بھی یہی ارشاد ہے کہ ایسی اور بہت سی دوسری تحریکات پیش کرنی ہیں اور وقت مقررہ میں اپنے کام کو ختم کرنا ہے لہذا میں اپنی تقریر کو ختم کر کے آپ حضرات سے امید کرتا ہوں کہ اس تحریک کی پوری پوری تائید کریں گے۔

مولوی محمد خیر الدین صاحب وکیل نے اس کی تائید میں کہا کہ حضرات! جس رزلوشن کی تائید کیلئے میں کھڑا ہوں اس کے مؤید مولوی سید محمد نعیمی صاحب سابق مددگار صدارت العالیہ تھے ان کے تشریف نہ لائے تھے وجہ سے مجھ کو اس کی تائید کے لئے اس وقت کہا گیا اور وقت بھی بہت کم ہے اس لئے میں کوئی زیادہ تقریر اس موضوع پر نہیں کروں گا۔ تحریک کے الفاظ آپ نے سن لئے اور جناب محرم صاحب نے اس پر کافی روشنی ڈالی جو انسان کا زیور علم و اخلاق اور دینیات ہے انسان کی انسانیت ہی سے ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ جس طرح ہم دیگر جملہ علوم و فنون میں یورپ کی تقلید کر رہے ہیں۔ اسی طرح علم اخلاق میں بھی یورپ کی تقلید کر رہے ہیں حالانکہ اخلاق یورپ سخت نقصان دہ ہیں۔ جیسا کہ مولوی فیض الدین صاحب نے بصراحت فرمایا ہے ہم کو اخلاق یورپ کی کورانہ تقلید سے باز رہنا چاہئے۔

ہمارے ملک میں اخلاق و انسانیت کی تعلیم کا یہ حال تھا کہ قیام سلطنت سے لیکر ۲۵ سال قبل تک جو علوم ادب و اخلاق و دینیات کے ہی دئے جاتے تھے۔ اور فارسی میں منشی۔ منشی عالم۔ منشی فاضل۔ عربی میں مولوی۔ مولوی عالم اور مولوی فاضل کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن اب اخلاق و دینیات کی تعلیم کبیلے عثمانیہ یونیورسٹی میں دیگر علوم و فنون کے ساتھ صرف ایک شعبہ دینیات قائم ہے۔ جب تک اخلاق و دینیات کی تعلیم کا انتظام عام طور پر ہنر ملک کی اخلاقی حالت درست نہیں ہوگی۔ شعبہ دینیات میں بہت کم طلبہ شریک ہوتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اخلاق و دینیات کی تعلیم عام ہو اور اس مضمون میں طلبہ بکثرت شریک و کامیاب ہوں۔ ہر شخص اپنے بچوں کی تعلیم دینیات کا خواہاں ہے اور استاد چاہتا ہے کہ میرا شاگرد ذریعہ اخلاق سے آراستہ ہو لیکن آپ بتا سکتے ہیں کہ ہم نے اس کے لئے کیا تجویز اختیار کی ہے اور ہمارے بچوں کی تعلیم اخلاق و دینیات کا کیا حال ہے۔ اس کا نصاب کیا ہے ہر شخص کا فریضہ ہے کہ وہ ان امور کی نگرانی طلبہ کی ابتدائی عمر میں ہی کرے ورنہ جب انسان کی ایک سیرت بن جاتی ہے تو پھر اس کا بدلنا مشکل ہے۔ دینیات و اخلاق کی تعلیم صرف کتابی ہی کافی نہیں ہوتی اس کے لئے عملی سبق دیا جانا ضروری ہے تاکہ اخلاق و دینیات کی تعلیم سے حقیقی طور پر طلبہ مانوس ہوں۔ اور وہ جب تعلیم سے فارغ ہوں تو ذریعہ اخلاق سے بھی آراستہ ہوں۔ اس موقع پر اس سے زائد میں آپ کا وقت لینا نہیں چاہتا اور اپنی تقریر کو ختم کر کے امید کرتا ہوں کہ اس تحریک کی تائید پر جوش طریقہ پرفرائیں گے۔ یہ تحریک باتفاق آرا منظور ہوئی۔

بعد ازاں مولوی محمد فاروق صاحب بی۔ اے۔ ایچ۔ سی۔ بیس مددگار نائلس ملدیہ مجلس مقامی اور تعلیم کے عنوان پر حسب ذیل مضمون پڑھا۔

جناب صدر و معزز حاضرین! کچھ دن نہیں گزرے کہ ہماری مجلس بلدیہ میں یہ تحریک پیش ہوئی تھی کہ شہر حیدر آباد کے تمام حلقوں میں بجانب بلدیہ مدارس شبینہ کا قیام عمل میں لایا جائے اور تعلیم بالغان کی طرف خاص مدد سے توجہ کی جائے۔ اس بارے میں سررشتہ تعلیمات سرکار عالی کے منور سے سے ایک سکیم کی ترتیب کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر کی جائے تاکہ اندرون و دواہ وہ اپنی رپورٹ پیش کرے۔ ناظم صاحب بلدیہ نے اس تحریک پر یہ رائے ظاہر کی تھی۔ ”سرکار عالی نے یہ پالیسی تسلیم کی ہے کہ رعایا کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے جملہ مصارف کو وہ خود برداشت کرے گی۔“

برطانوی ہند میں شہنشاہی اور صوبہ داری حکومتوں کی اس مخصوص میں پہلوچی کیوجہ مجلس بلدی کو بارگاہاں اپنے ذمہ لینا پڑا کہ جسے وہ اپنے منزلیہ اور ذرائع کی کمی کی وجہ اچھی طرح تکمیل نہیں کر سکیں موجودہ رجانات برطانوی ہند میں یہی پائے جا رہے ہیں کہ حکومت خود ان امور کا ذمہ لے چند مدارس سلطان بازاریں جواب تک بلدیہ کے زیر انتظام

میں ان کو سرکار میں منتقل کر دیا جانے لگے۔ تحریک نہایت مفید ہے لیکن دیگر اہم امور اصلاحِ بلدیہ سے فارغ ہونے کے بغیر سرمایہ کی ضرورت ہے فی الوقت جبکہ گورنمنٹ خود تعلیم کی ضرورت پر توجہ ہے تو حکومت کے عملیات سے استفادہ پر قناعت کافی ہے زیادہ سے زیادہ مجلسِ بلدیہ ان مدارس کے قیام کی ضرورت کے متعلق ایک رزلویشن پاس کر کے سرکار کو توجہ دلا سکتی ہے۔ آج کے جلسہ میں مجھے اسی موضوع سے متعلق کچھ تفصیلات عرض کرنے کی اجازت ہو۔

حضرات! برطانوی ہند میں یہ عہد لارڈ ڈولیم ہنگ تعلیم کا انتظام بنیاد حکومت شروع ہوا۔ لیکن یہ امر کہ سرسید مرحوم کو خاص اہتمام سے مدرسۃ العلوم قائم کرنا پڑا اس کا اظہار ہے کہ جس قسم کی تعلیم کا انتظام ہوا تھا اسے اہل ہند کی ضروریات کی تکمیل کے لئے کافی نہیں سمجھا گیا تھا۔ یہ امر کہ اہل ہند کو ایک غیر زبان میں تحصیلِ علم کی مجبوری تھی ایک اور نقصِ عظیم تھا سرکار کا بیان کہ بہت عرصہ تک کسی ہندوستانی کو تاریخِ ہند کی تعلیم دینے کا جامعات میں موقع نہیں دیا گیا تھا۔ ایک اور لطیف اشارہ ہے اور سرگڑھ کھلے کی یونیورسٹی کونسل میں یہ تحریک کہ سارے ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کے لئے اسے مفت اور جبری کر دیا جائے اس کا اعلان تھا کہ ملک میں توسیع و ترقی تعلیم کی احتیاج محسوس ہونے لگی تھی۔

۱۹۱۰ء کے قانونِ حکومت ہند میں ان ہی تقاضوں کے اثر سے ہر صوبے میں انتظامِ تعلیم کو ایک نمایندہ وزیر کے سپرد کیا گیا۔ اگرچہ کہ یورپی مدارس بدستور کسی انجیکشن کو نسل کی نگرانی میں رکھے گئے۔ لیکن وزراء نے تعلیم کے لئے بھی تاجد سریشہ تعلیم موازنہ میں رقم کی فراہمی حسب سابق دشوار رہی۔ میں یہاں اپنے موضوع سے کچھ گریز کر دھکا۔ یہ ایک حقیقت تاریخی ہے کہ ہندوستان میں حواہ وہ ہندو راجاؤں کا دور ہو کہ مسلمان بادشاہوں کا زمانہ شکر شاہی کے اطراف اور گھاٹ اور صوبہ جات میں جو آبادیاں قائم ہو جاتی تھیں وہاں پینے کے پانی باولیاں تالاب۔ بازاروں کے لئے شفا خانہ دیندار کے لئے عبادت گاہیں لاکھوں کے لئے مدارس اور کتب مسافروں کے لئے سرائیں اور سڑکیں۔ تاجروں کے لئے منڈیاں اور گچ حکومت کی طرف سے قائم ہوتے تھے اور حکومت بھی ان کی نگہداشت کرتی تھی۔ بہت آبادیوں کے دینی تنہات قیام امن و دفعِ خسومات اور وادری کی حد تک آبادیوں کی اپنی اپنی پنجابوں کے سپرد تھے الگ الگ پیشہ وروں کو جدا جدا کرتے۔ اور ہر ایک کی اپنی اپنی تنظیم قائم تھی۔ ان حکومتوں کا ایسا کرنا اس لئے تھا کہ وہ اس سرزمین کو جہاں ان کا تسلط تھا اپنا بنا چکے تھے اور جی کھول کر صرف کرتے تھے اور اس لئے کہ ایک طرف ان آبادیوں میں محنت و معیشت کی وجہ خوش حالی رہتی دیکھ کر امن و امان قائم رہنا کہ جس سے دارِ اخلاص کی سلطنت رہتی۔

مگر شرقی و غربی مسائل ہند پر جو برطانوی آبادیاں قائم تھیں وہاں بہت عرصہ تک شہریوں کی حمایت کے خطرات کا خیال ہی نہیں کیا گیا۔ یہ واقعہ قابلِ تذکرہ ہے کہ وڈسٹ سینٹ جارج مدارس کے قریب کی ایسی آبادی کا نام ہی بلیک ٹاؤن تھا۔

اس عدم توجہ سے ہیضہ اور دوسرے قسم کی بیماریاں آسے دن ساتی تھیں جس کا اثر اندرون قلعہ بھی نمودار ہو کر رہا۔ لامحالہ ارباب اقتدار کو کچھ انتظام کرنا پڑا۔ چنانچہ بیبی کی حد تک وہاں شہر سے دور ایک تالاب بصرفہ حکومت تیار ہوا۔ کچھ عرصہ خاکسے بنی اور خاکشک برداری کے لئے بھی حکام نے مامور کیا۔ لیکن روز افزوں آبادی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی تکمیل کے سنے اخراجات میں اضافے کے تھے۔

جلد ہی میران ہن (جسٹس آف دی پیس) کی ماموری ہوئی اور بعد ازاں مجالس مقامی کی طرح ڈال دی گئی تاکہ آبادی کے مقامی محاصل وصول کئے جا کر چند ایک نمائندوں کی شرکت اور مشورت سے ان امور کی تکمیل کی جائے۔ یہ امر قابل لحاظ ہو کہ جو مقامی مجالس اس طرح قائم ہو جائیں ان کو فصل خصوصیات و اداریہ یا قیام امن سے تعلق نہ تھا۔ اگر بھی قابل لحاظ ہے کہ بعد میں آرائش شہر کیسے صلحہ مجلس قائم کی گئی تو اس کے اخراجات کے لئے بھی مقامی محاصل کو بخش کیا گیا۔ یہ نہ ہوا کہ حکومت اپنے ہی موازنہ سے جلورقوم کی فراہمی کا ذمہ لیتی۔ خلاصہ یہ کہ ہندوستان کے سب سے آباد شہر بیبی کی تمام شہری آسائشیں وہاں کے اہل شہر نے اپنے ذمگی محاصل مقامی کی ادائی سے فراہم کی ہیں۔ اور شہروں کا بھی کم و بیش یہی حال ہے اور وہاں کے مقامی ادارہ ہائے حکومت کے ارتقا کا ماحصل یہی ہے۔

۱۹۱۹ء سے بہت پہلے ہی یعنی ۱۸۵۷ء سے ابتدائی تعلیم مجالس مقامی سے متعلق ہو چکی تھی۔ یعنی وہ رقم فراہم کرتے اور مدارس بہ اہتمام سررشتہ تعلیم قائم ہوتے تھے مگر ۱۹۱۹ء کے بعد ورزائے تعلیم نے گوپال کرشن کوکھلے کے نصیبین کی تکمیل سے خود کو قاصر پایا تو انہوں نے اپنی مدد آپ کرنے کے اصول پر مجالس مقامی کا توسط دھونڈا۔

چنانچہ احاطہ بیبی میں داکٹر برانچنے کے ۱۸۲۳ء کے پرائمری ایجوکیشن ایکٹ کی رو سے حکومت نے ابتدائی تعلیم مفت اور جبری کرنے کو اپنا نصب العین مقرر کرتے ہوئے ابتدائی تعلیم کے انتظامات بالکل مجالس مقامی سے متعلق کر دئے۔ طریقہ ہائے کار مقرر ہو گیا کہ اگر حکومت کسی مقامی نظم و نسق کو موزوں اور اہل پائے تو وہاں ایک اسکول بورڈ قائم ہو سکے گا جس میں مجلس مقامی کے چند ارکان بہ طور نمائندہ مجلس شریک ہوں گے۔ نیز بجانب حکومت بھی چند کو نامزد کیا جائے گا تاکہ فیصلہ اعتدال پست اقوام کی نمائندگی کی تکمیل ہو نیز کسی ایک خاتون کو بھی شریک کیا جاتا تھا اور ساتھ ہی کوئی ایک رکن ایسا بھی شریک کیا جائے جس کو تعلیمی تجربہ ہو۔ ایک افسر تعلیم کا بھی تقرر مجلس مقامی سے ہوتا مگر یہ تابع منظوری سرکار تھا۔ یہ بات حکومت اور مجالس مقامی کے مابین وجہ نزاع بنی ہوئی تھی کہ کیوں اسکول بورڈ صلحہ قائم ہو۔ اور کیوں نہ مجلس مقامی بھی اسکول بورڈ سے متعلق اختیارات و تقررات کی مجاز نہ ہو اور اسی وجہ خصامت کی بنا پر بسا اوقات مجالس مقامی اور متعلقہ اسکول بورڈ میں تنازعات پیدا ہو جاتے تھے اور افسر تعلیم بھی چین نہ پاتا تھا۔ مجالس مقامی اور اسکول بورڈ میں بے پڑے ممبروں کا

بھی انتخاب ہو رہا تھا کہ جن کو تعلیمی مسائل سمجھنے میں کافی حوصلہ ہوتی تھی اور نہ ہمدردی رہتی تھی۔

حکومت صوبہ مجاز ہو گئی کہ کسی ادارہ تعلیمی ہسکول بورڈ کو ابتدائی تعلیم مفت اور عام کرنے کے لئے اسکیم کی تیاری کا حکم دے۔ بعد نتیجہ اگر حکومت اسے منظور کرے تو متوالی وغیرہ متوالی اخراجات کا نصف تا بعد مجالس بلدی اور ایک ٹکٹ تا بعد مجالس اضلاع بطور گرانٹ دیا جائے گا۔ نفاذ قانون کے بعد سے بھی مدارس ابتدائی کو منتقل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ بہت زیادہ آمادگی کا اظہار مجالس مقامی نے نہیں کیا کیونکہ وہ اس بارگراں کو سنبھالنے کی خودی سکت نہیں پاتی تھیں ۱۹۳۳ء تک ۴۴ مجالس مقامی نے ابتدائی تعلیم مفت کر دی تھی اور سات نے اسے جبری بھی کر دیا مگر حکومت کا جلد صرف ساٹھ پانچ لاکھ ۸۹ ہزار چار سو ہوتا تھا۔ شہر ممبئی کی مدد تک بھی کچھ ایسا ہی انتظام قانون بلدیہ بمبئی کی تربیم سے ہوا۔ بارہ ارکان بلدیہ اسکول کمیٹی میں شریک ہیں اور بقیہ چار غیر ارکان بلدیہ ہوتے ہیں مگر انھیں بلدیہ ہی نامزد کرتی ہے۔ پھر بارہ ارکان بلدیہ کے چار مسلمان اور تین پست اقام سے ہوتے ہیں اور چار غیر ارکان بلدیہ میں دو خواتین ہیں ۱۹۳۷ء سے پہلے تک بلدیہ ممبئی کو توالی و شہر کے اخراجات کے لئے حکومت کو رستم اور کرفی تھی اور حکومت بمبئی ابتدائی تعلیم کے لئے گرانٹ ملتی تھی ۱۹۳۷ء میں اس نگرہ کے تحت کہ قیام امن داورسی حکومت کا خاص فریضہ ہے اور ابتدائی تعلیم و حفظان محنت شہریوں کی اپنی ذمہ داری یہ طے ہوا کہ بلدیہ کو توالی کی اخراجات دی اور نہ حکومت ابتدائی تعلیم کے مصارف کیلئے گرانٹ دے۔ البتہ حکومت کی فرمائش پر بلدیہ ابتدائی تعلیم کو مفت اور فارمی قرار دی تو پھر حکومت زیادہ مصارف کا ایک ٹکٹ ادا کرے گی نیز اگر حکومت آئندہ ابتدائی تعلیم کے مصارف تا بعد شرکت مصارف اپنی ذمہ داری زیادہ کرے بلدیہ ممبئی بھی مستفید ہوگی حکومتی عہد داروں کو سامانہ مدارس کا مجاز رکھا گیا اور ان کی حفاظت بتوسط ناظم تعلیمات اسکول کمیٹی میں قابل توجہ قرار پائیں۔ لیکن ۱۹۱۹ء کے بعد جب بلدیہ ممبئی نے جبری تعلیم کی ابتدا کی تو حکومت نے مدارس کی عمارتوں کے کرایے مدرسین کی تنخواہوں وغیرہ سے متعلق مصارف کو ذائد تصور کرتے ہوئے تخفیف مصارف کا مطالبہ کیا اور آخر اسی گفت و شنید کے دوران میں جو گرانٹ کہ جاری ہوئی تھی اسے بند کر دیا گیا اور عدالتی جارجونی بھی ناکام رہی۔ اب حکومت سے بلدیہ ممبئی کو اگر کوئی مدد ملتی ہے تو وہ تا بعد تعمیر اکٹہ ہے جہاں تک کہ احاطہ مدارس کا متعلق ہے وہاں بھی یہ طے ہوا کہ کوئی مجلس منسلک یا مجلس بلدیہ اگر اپنے حدود و اثر میں ابتدائی تعلیم کو عام کرنا چاہے تو بشرطیکہ صاحب کلکٹر منسلک یہ خیال کریں کہ ان حدود میں تعلیم کا عام کیا جانا مناسب اور موثر ہوگا تو پھر بعد منظوری حکومت انھیں ایک خاص شرح سے ٹکس تعلیمی وصول کرنے کی اجازت ہوگی اس طرح جو رستم جمع ہوگی اسی کے مساوی رقم کا حکومت سے عطیہ ملے گا۔ اور مقامی مجلسیں مجاز ہو گئی کہ اپنے مالیہ سے اس خصوص میں اور رقم دیں اس طرح سے سہرا یہ تعلیم ابتدائی قائم ہوا دی انتظامات مدارس کی مدد حکومت کے عہدہ داران ضلع و عہدہ داران سررشتہ تعلیم کے اختیارات بہت کافی وسیع تھے

اور بہت سارے امور منظوری حکومت کے محتاج تھے۔ خالص تعلیمی امور کی حد تک اور نگرانی کے لئے ہر ضلع میں ایک شورٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن کونسل بھی قائم تھی جس کو اب برعاست کرنا پیش نظر ہے۔ اس میں ہر مجلس بلدیہ اور مجلس ضلع کے نمائندے نیز ضلع کے حکومتی عہدہ داروں شرک رکھتے تھے۔ جو مدارس امدادی ہوتے تھے ان کا اس کونسل سے مسلم مامور ہی تھا۔

تا بعد حیات ابتدائی تعلیم کو توسیع کے لئے یہ انتظام تھا کہ اگر کوئی چاہت ٹرینڈ مدرس کو ملازم رکھے قواعد مدارس کی پابندی کرے اور مکان کا انتظام کرنے کا ذمہ لے اور ذات پات کا امتیاز نہ ہو نیز اخراجات متفرق و صادر کو خود ہی پورا کرے تو ماہانہ عہدہ اور عہدہ کی امداد بلحاظ تعداد طلبہ حکومت سے دی جاسکتی ہے۔ سا ان تعلیمی کے لئے نیز تعمیر و تزئین مکان کے لئے بھی نیز اور طرح کے اضافہ اخراجات کی صورت میں گرانٹ دی جاتی ہے بشرطیکہ چاہتیں بھی اپنا حصہ رسی زائد کر دیں ان مدارس کو امداد متعمم ضلع کی راسے اور ناظم مجلس مقامی و بلدی کی منظوری سے دی جاتی ہے اور اس کے لئے ان مدارس کا ڈسٹرکٹ ایجوکیشن کونسل کے نزدیک مسئلہ قرار پانا ضروری رکھا گیا ساتھ ساتھ یہ شرائط قائم تھیں کہ قابل اعتراض کردار کے مدین مامور نہ کئے جائیں معینہ نصاب کے سوا کوئی اور مضمون پڑھایا نہ جائے اور ملک منظم قیصر ہند کی تصویر آویزاں رہے۔

حلاۃ احاطہ بمبئی ہو کہ احاطہ مدراس ہر جگہ نصاب کے نصین مضامین کی تجدید و مزید درجوں کے قیام مدرسے میں ترانوں کی ترویج و نو کا آویزاں کیا جانا۔ کثافت کی تعلیم مدین کی ٹریننگ اور معیار قابلیت کا تعین اور ماموری بالکل بجا طور پر حکومت کی منظوری کے محتاج تھے حیابات کی سرکار سے تنفیج ہوتی اور اراکین مجلس مقامی سے اخراجات نا واجب وصول کرنے کا امکان بھی تھا بہت سارے قواعد بھی منجانب حکومت نافذ تھے اور حکومت کا اختیار وین قواعد بہت ہی وسیع تھا اور مسلسل ہتھمال ہوتا رہتا تھا۔ شہر مدراس اور شہر بمبئی میں بلدی مدارس کے جو انتظامات ہیں اسکا اجالی تذکرہ یہاں خلی از دیچپی نہ ہوگا۔

شہر بمبئی میں انتظامات کی پوری ذمہ داری اسکول کمیٹی پر ہے جو ایک مرکب جماعت عالمہ ہے کمیٹی کا ایک سکرٹری ہزار روپیہ تنخواہ پر مامور ہے لیکن جلد اختیارات عالمہ حتی کہ چپراسیوں اور منصرم چیراسیوں کے تبادلے اور رخصت کا منظور کرنا کمیٹی سے متعلق ہے جسکی وجہ مراسلت میں زیادتی اور صرف وقت کی عام شکایت ہے اور نظم و نسق میں وہ ہم آہنگی نہیں جو بلدیہ بمبئی کے دیگر محکموں میں ہے اکثر ماتحتین کا کوئی نہ کوئی رکن اسکول کمیٹی سرپرست سا گیا مسلسل وہاں کے سکرٹریوں نے جو جلد جلد بدلتے رہے ہیں اس پر توجہ دلائی ہے کہ اسکول کمیٹی خود کو کیسی طے کرنے اور نگرانی کرنے کی حد تک محدود رکھے اسکول کمیٹی اپنا سوا ذمہ آپ بنا کر ناظم بلدیہ بمبئی کے ہاں روانہ کرتی ہے جنہیں داخلی انتظامات مدارس میں بہت کم دخل ہے بلدیہ میں صرف یہ تعین ہوتا ہے کہ اس سال کتنی رقم اسکول کمیٹی کو دی جائے

موازنہ اسکول کھٹی میں اگر مختتم طور پر طے ہوتا ہے۔ بلدیہی میں دہاں کے جملہ سات حلقوں میں دو حلقوں میں چلن مزدور آبادی زیادہ ہے تعلیم لازمی ہے حال میں دو اور حلقوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے کہ جہاں مسلمان زیادہ آباد ہیں مدارس مرہٹی گجراتی اور اردو کی سانی اساس پر منقسم ہیں اور مدارس صبیان کے لئے ایک ایک ہتم اور مدارس صبیاء کے ایک ایک ہتمہ مامور ہے مگر ان کے فرائض صرف نگرانی کے ہیں سزا و جزا سے کوئی تعلق نہیں اور وہ مدارس کی حد تک دفتری کاروبار اردو میں ہوتا ہے حاضری کے رجسٹر اور برادرات سبار دو ہیں۔

اردو اسکول کی معلما اور مرہٹی اسکول کے معلموں کے لئے دو ٹرننگ اسکول بھی قائم ہیں۔ جامعہ ہائے صغیر کے لئے شفٹ سسٹم رائج ہے مسلمان لڑکیوں اور معلما کے لئے پردہ گاڑیاں ہیں مدارس کی عمارتیں بہت زیادہ تعداد میں کرایہ کی اور ناموزوں ہیں بڑی قسم مصارف میں کرایوں کی بابت شریک ہے اب اب کچھ عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں اسکول کھٹی کی اجازت سے مدارس کی عمارتیں اور فریجراہل محلہ کو تقاریب کے لئے مستعار دی جاتی رہی ہیں صبیان و صبیاء کے طبی امتحان کا بندوبست ہے اور بلدیہ دو خانوں سے دو ایں دی جاتی ہیں کنگ آڈور ڈیموریل ہاسپٹل میں ایک وارڈ خاص ان کے علاج کے لئے قائم ہے اور ایک موٹر لاری مرہٹن بچوں کو دہاں پہنچاتی ہے کٹانی جاری ہے طلبا طالباء جملہ پانچ ہزار پانسو شریک ہیں حال ہی میں لارڈ بیڈن پاول کے مرکز سے اس کا تعلق قطع کر دیا گیا۔ تعلیم ورزش جسمانی کا بھی انتظام ہے اساتذہ کا اپنا کتب خانہ ہے جس کی کتابیں مدرسہ مدرسہ گشت ہوتی ہیں۔ جبری تعلیم سے متعلق ایک افسر حاضری اینڈ انسپکشن افسر ہے جس کے ماتحت کئی انسپکٹر ہیں کہ جو ہر سال ۶ سے گیارہ سال کی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کی فہرست تیار کرتے ہیں اور نوٹس کی اجرائی ہوتی ہے۔ چالان کرنے کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔ بعض مقامات پر پورے مدرسہ کی جگہ صرف دو دو جماعتیں قائم ہیں۔ لڑکیوں کی حد تک ان کو تعلیم دلانے میں تامل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان سے ماؤں کو گھر میں مدد ملتی ہے اور تعلیم ایسے امور کی نہیں دی جاتی کہ گھریلو زندگی میں کام آئے۔ ایک قابل لحاظ تعداد مدارس امدادی کی بھی ہے جنہیں سرکار سے منظورہ قواعد کے تحت امدادی جاتی ہے ان کے لئے بھی ایک ہتم مامور ہیں ۱۹۳۳ء میں جملہ بلدیہ مدارس صبیان ۳۱۱ مدارس صبیاء ۳۹ تھے اور امدادی مدارس ۴۷ تھے تعداد طلباء کا اتنی ہزار پانسو سات تھی اور سالانہ صرف نمیں لاکھ سے کچھ تجاوز تھا فی طالب علم صرف چھپالیس روپیہ چھ آنہ بنا یا گیا تھا کہ جو یقیناً زاید از ضرورت سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسکول کھٹی کا اپنا الگ دفتر ہے کہ جو ایک سابقہ مارکٹ میں قائم ہے کہ جو عدم موزونیت سے آباد نہیں کیا جاسکا۔ تعلیم انہاں کیلئے مسٹر زبان اعزازی اور رضا کارانہ طور پر انتظامات شروع کر رہے تھے۔

شہر مدراس کی حد تک کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے وہاں ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی کئی گئی۔ مسلمان لڑکیاں پہلے تین سال تک مستثنیٰ تھیں۔ انتظامات کے لئے کمشنر کے ماتحت ایجوکیشنل افسروں جس کا تقرر تابع منظوری سرکار ہے۔ مدارس نسواں کے لئے ایک مہتممہ میں اور مجلس بلدیہ کی اعانت کیلئے ایک مجلس قائمہ تعلیم ہے مدارس فرقی اساس پر قائم ہیں۔ مسلم مدارس میں اردو ذریعہ تعلیم ہے اور دینیات کی تعلیم لازمی ہے۔ مسلم مدارس نسواں کیلئے ایک مسلمان ناظرہ مامور ہیں اور ان کا معائنہ ایجوکیشنل افسر کمشنر بلدیہ کے لئے ناکیداً منع ہے۔ مسلمان لڑکیوں کیلئے پردہ گاڑیاں ہیں اگرچہ ۱۹۲۶ء میں بہ تحریک سٹریٹیا مورنی مزید گاڑیوں کی فراہمی نامنصور ہوئی۔ محکمہ کے افعال میں وہ اسے گوارہ نہیں کر سکتے تھے کہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں اپنی نشوونما کے زمانہ میں پردہ کی پابندی میں۔ کئی مدارس کی عمارتیں بطور خاص موزونیت کے ساتھ تعمیر ہوئی ہیں۔ ہر مدرسے میں کچھ حرفی تعلیم فرنیچر سازی یا پارچہ بانی کی جاری ہے۔ سال حال تک بلدیہ کی اپنی نشر گاہ سے بلدیہ کے دس مدارس ملحق تھے۔ بہت افسر بلدیہ با د ا د چار مڈکل انسپکٹران طلباء کو طبی معائنہ کے ذمہ دار ہیں اور ضروری علاج بھی کیا جاتا ہے بلدیہ کی عمارت میں مرکز کشف قائم ہے کل کشف ایک ہزار پانسو پچاس میں۔ جلد بلدی مدارس میں غریب و نادار لڑکوں کو دوپہر کا کھانا منجانب بلدیہ کھلایا جاتا ہے۔ سالن میں گوشت شریک نہیں رہتا لڑکھانا پکانے والے برہمن نہیں ہیں بلکہ نگر انکار پکو ان ایک مسلمان صاحب تھے ایک مرکز سے پکو ان کے بعد المونیم کے دیگچوں میں کھانا سالن بھر کر مدارس کو چار لاریوں کے ذریعہ جاتا ہے ہر مدرسے میں رکابیاں چھپے محفوظ رہتے ہیں جلد چار ہزار دو سو طلباء کو تیس ہزار سالانہ کے صرف سے کھانا کھلایا جاتا ہے۔ صفحہ اٹنڈنس افسر نہیں ہیں مدرسین اور ناظران مدارس بھی نگران ہیں اور شہری کھیتیاں بھی ہیں تعلیم بالغاں کے مدارس کی عمارتیں شب میں ستار دی جاتی ہیں۔ بلدیہ کے دارالمطالعہ بھی ہیں اور چوالیس امدادی دارالمطالعہ میں ۱۹۳۳ء میں جلد تعداد مدارس ۴۴۴ تھی اور تعداد طلباء تیس ہزار ۲ سو انیس غیر بلدی مدارس ۲۵۲ تھے اور ان میں طلباء کی تعداد ۶ ہزار ۵ سو ۵ تھی۔ جلد اخراجات ۸ لاکھ ۹ ہزار ۵ سو ۶ تھے جنہیں کرایہ مدارس پر صرف ۵۰ ہزار سالانہ صرف ہو گیا بلکہ بلدیہ کی اپنی عمارتیں نہیں ہیں ایک ہی اسکول بھی بلدیہ کی طرف سے قائم ہے۔ اضلاع مدراس میں مدراس و سلیم میں بلدیہ کی جانب سے کلج قائم ہیں اور تقریباً ہر بلدیہ کی تمام میں ایک ایک اسکول ہے۔ حضرات!۔ مجالس مقامی نے شہنشاہی حکومت اور صوبہ داری حکومتوں کے دوش بدوش تعلیم کا انتظام اپنے ذمے کسی قسم کے جذبات مشغیت و مغالطہ کے تحت نہیں لیا اور نہ کوئی ایسی تعلیم عمل ہوئی تھی کہ ابتدائی تعلیم مقامی حکومتوں سے اور فوقانی اور جامعی تعلیم صوبہ داری حکومتوں سے متعلق ہو اور سب کا قیام تعلیم سے حکومت ہند کو سرکار دہی بلکہ یہ اس لئے

ہوا ہے کہ کسی طرح سے بھی ترقی و اشاعت علم ہو۔

لیکن جب ان امور کو دیکھا جاتا ہے کہ جو ان مجالس کے ذمے میں مثلاً شہر کی صفائی۔ شہر سے امر امن کا ذمہ مضبوط خطرناک اشیاء خورد و نوش کی تجارت پر نگرانی۔ انتظام آب رسانی۔ راستوں کی اور مواریث کی تعمیر اور روک ٹوک۔ غزبا کے لئے اکیٹھ کی تعمیر۔ مدفون اور مرگھٹوں کا تعین۔ ولادت و اموات کی رجسٹری۔ فایر برگ کیڈ کا قیام۔ مراکز بھال زچگی خانوں کا قیام۔ بازیگا ہوں سبزہ زاروں کی باغات کی تعمیر تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ امور اتنے تفصیلی میں کہ جن پر کسی بلدیہ کی آمدنی خواہ کتنی ہی زیادہ ہو پوری اور پوری صرف کر دی جاسکتی ہے۔ دراصل حالیکہ ان کے وسائل آمدنی کے محدود رہنے کی وجہ آمد و خرچ میں توازن رکھنا مشکل رہتا ہے۔ اس کے ساتھ اہل شہر کی تعلیم کے لئے رستم فراہم کرنا کہ جس ضمن میں انہیں انتظامی اخراجات کی کیسوئی بھی کرنی ہوگی ان کے لئے وقت طلب ہے۔ کہتے ہیں کہ پوری پوری غذا اٹھانے سے بچوں کی نشو و نما کی رہتی ہے بالکل اسی طرح کا حال مجالس مقامی کے انتظامات تعلیم کا ہے۔

چنانچہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مجالس مقامی نے جو مدارس قائم کئے ہیں ان کا بلحاظ نتائج و افادہ سرکاری مدارس کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ پرائیگ کمیٹی کی رپورٹ میں یہ امر بہت واضح کیا گیا ہے کہ جتنی رقم صرف ہو رہی ہے اتنا فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ حکومت بھٹی نے بھی اپنی ایک شائع کردہ یادداشت میں اس کو قبول کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مدرسین جنہیں اطمینان حاصل رہتا ہے اور اپنے کام سے دلچسپی ہوتی ہے اپنے شاگردوں کو اعلیٰ درجوں تک پہنچانے کا دوسرے کے مقابل میں زیادہ لحاظ رکھتے ہیں۔

ایک اور امر قابل لحاظ ہے۔ انگلستان میں خواہ کوئی پارٹی برسر وزارت ہو پرنسٹ پیول سروس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور نہ ان کو تبدیلی وزارت سے کچھ اندیشہ رہتا ہے موجودہ قانون حکومت ہند میں گورنرانہ کی خالص فرائض میں ہے لیکن مجالس مقامی کے ملازمین کی حد تک یہ شکایات ہندوستان کے ہر صوبہ میں عام ہیں۔ بلاشبہ حکومتوں نے نگہداری تنبیہ نگرانی اور سماعت مراعات اور غیر قانونی قواعد کے ذریعہ اس کی روک تھام کی کوشش کی ہے۔ ماسوا اسکے مجالس مقامی کے ملازموں کے لئے ترقی کی گنجائش بھی محدود رہتی ہے اگرچہ ملاکس میں جلد مجالس مقامی کے بہت افسروں اور انجینئروں کو ایک ہی سلک ملازمت میں شامل کر کے ان کے باہمی تبادلوں اور ترقی پانے کے امکانات فراہم کئے گئے ہیں۔ لیکن ہیڈ ماسٹروں کی حد تک ابھی یہ انتظام نہیں ہو سکا۔ ان وجوہ سے مجالس مقامی کے ملازموں میں سکار کے ملازموں کے مقابل کارکردگی اور صلاحیت کی کمی رہنا باعث تعجب نہیں ہے۔

بالفاظ دیگر اس ابتدائی مدارس میں ملازمین نہ تو مطمئن ہیں اور نہ اپنے کام میں دلچسپی لیتے ہیں۔

یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے حکومت ہائے صوبجات بالکل عمومی نمائندوں پر مشتمل ہیں۔ مالیات بھی ان سے متعلق ہو جو قانونی تحفظات اور قیود کے وہ بڑی حد تک خود مختار ہیں اور موازنہ کی ترتیب میں مدت خرچ کو گنناڑھا سکتے ہیں نصاب کے تعین مضامین کے اضافے یا تخفید مدرسوں میں ملازموں کی ترویج فونوں کا آویزاں کرنا کٹانے کی منظم مدرسین کی تربیت وغیرہ کی حد تک پالیسی بنانا اور اسکا تعین کرنا بالکل ان ہی سے متعلق ہے اور اب تعلیم سے متعلق انکی پالیسی پل رہی ہے دو یا مندر اکیم و ردھا اسکیم اسی بنا پر نمایاں حیثیت حاصل کر سکی ہیں اس ضمن میں دو واقعات قابلِ ملاحظہ ہیں احاطہ مدراس میں فوقانی تعلیم کی حد تک یہ طے کر دیا گیا ہے کہ اب حکومت براہ راست ان کے انتظامات کی ہو گئی کریگی اگرچہ کہ خرچ بدستور مجالس مقامی ادا کریں گی۔ واضح رہے کہ موجودہ وزیر تعلیم مدراس دو علی کے زمانہ میں بھی وزیر تعلیم تھے اور بھی کئی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔

احاطہ ممبئی میں ایک حکم یہ ہوا ہے کہ مجالس مقامی سے متعلقہ مدراس کے مدرسوں کے تبادلے کرنا انفران تعلیم کے استزاج و منظور پر مشروط کر دیا گیا ہے یہ اطلاع اخبارات میں آئی تھی کہ اس حکم کے نفاذ سے پہلے ایک صدر نشین مجلس ضلع نے دو ہزار تبادلوں کے احکام جاری کئے اور اس پر وزیر اعظم بمبئی نے جو وزیر تعلیم بھی ہیں اسکا اہمیلی میں اعلان کیا تھا کہ یہ تبادلے فسخ کئے جا رہے ہیں۔

بالفاظ دیگر اس احساس سے کہ حکومت اپنی ہو چکی سرکار وغیرہ سرکار کا تفرقہ کم ہو چلا ہے لہذا پہلے جن امور کو سرکار تائید و ہمدردی نہ ہونے کی وجہ غیر سرکاری طور پر انجام دلایا جا رہا تھا ان کو سرکاری حیطہ عمل میں لائے جانے میں کئی مضائقہ نہیں دیکھا جاتا بلکہ زیادہ موثر اور کارگر طور پر کام ہونے کی امید کی جاتی ہے۔ حضرات! اس کانفرنس کے اولین اجلاس میں صدر نشین جلسہ سربراہر حیدر نواز جنگ بہادر نے مختلف صوبجات و ریاست ہائے ہند کی تعلیمی ترقی کا ایک ڈائی گرام اپنے خطبہ صدارت میں شریک کیا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ سب سے زیادہ ٹراونکور میں تعلیمی ترقی ہوئی ہے اور اس کے بعد ریاست کوچین کا درجہ ہے۔ آج بھی کم و بیش یہی حال ہے آپ کو یہ معلوم کرنے کو شائد تعجب ہو کہ نہ تو ٹراونکور میں اور نہ کوچین میں مجالس مقامی سے ابتدائی یا اور طرح کی تعلیم کا تعلق ہے۔

جہاں تک ملک سرکار بھالی کا تعلق ہے مسئلہ سے زرا گلزاری کے ہر ایک روپے کے ساتھ ایک لاکھ نہ ہو بلکہ نصف جع ہو رہا ہے اور اس میں سے دو پائی محکمہ تعلیمات کے حسبِ صوابید مدراس پر صرف ہوتے ہیں سرکار عالی اپنی آمدنی

کی دوسری مدت سے لکھو کھا رو یہ اس کے سوا صرف کر رہی ہے اگر مجالس کو کلفندہ اپنے ہی اہتمام و انصرام میں مدارس قائم کرنا چاہیں تو بڑی قسم تو نگرانی و تنقیح کے لئے مختص کر دینی ہوگی وراں حالیکہ یہی رقم محکمہ تعلیمات کے ذریعہ صرف ہونے میں سرکار عالی کے اپنے عہدہ و ترقی و نگرانی کی تکمیل کر لیتے ہیں۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں محکمہ پیدوار برقی بلحاظ کارکردگی بہت ہی اچھی حالت میں ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ یہاں نظم و نسق صوبجات اور اضلاع میں منقسم نہیں ہے بلکہ ایک مرکز پر مدور ہے کیا اسی طرح محکمہ تعلیم کا ہتم بالشان ادارہ بھی خوش نظمی کے خیال سے ایک مرکز پر لایا جاسکتا ہے بہر حال ایک حقیقت ہے کہ شریک یا ایک تالاب کا نظم و نسق کی غرابی کی وجہ خراب یا شکستہ ہونا نتائج کے لحاظ سے اتنا مضر و خطرناک نہیں جتنا کہ ایک مدرسے کا ناقص نتائج پیدا کرنا فسوس ناک ہے یہاں جو نقصان ہے وہ بہت زیادہ ہے کیونکہ آئندہ نسلوں کی یہودی یا بادی کا اس سے تعلق ہے ایک شریک پھر سے درست ہو سکتی ہے بلکہ بہتر ہو جاسکتی ہے ایک تالاب پھر سے بن جاسکتا ہے لیکن ایک لڑکے کا زمانہ طالب علمی اگر رائگاں اور لاعا مل طور پر گزر جائے تو پھر اس نقص کی تکمیل نہیں ہو سکتی آخر میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب سرکار عالی اہل ملک کو تعلیم دلانا اس طرح اپنا فرض خیال کرتی ہے کہ جسطرح ملک میں قیام امن و دادرسی اس کے فرائض میں تو پھر مجلس بلدیہ کا اس طرف توجہ کرنا زیادہ مناسب اور مفید ہوگا کہ طلباء کے لئے بازی گاہیں محلوں میں قائم ہوں۔ ان کے لئے سبزہ زار فراہم ہوں مراکز یہودی اطفال کی تعداد بڑھائی جائے ولادت کی جبری نظم ہو چمپک کے ٹیکے بہت زیادہ لگائے جائیں مدارس کے اطراف چورن اور دوسری شے لئے خورد نوش کے فروشندگان پر نگرانی رہے مدارس کے اطراف کی سڑکیں اور پیدل راستے گرد سے محفوظ کئے جائیں مدرسہ کے بچوں کے لئے پیرا کی کے حوض قائم ہوں۔ بازی گاہوں سبزہ زاروں اور پیرا کی کے حوض طالباۃ کے لئے علیحدہ بنائے جائیں اور نیز بلدیہ کے سیکڑوں مزدوروں کے بال بچوں کی تعلیم کے لئے سہولتیں فراہم کی جائیں تو بجائے خود بہت ہی نتیجہ خیر کام ہو رہے گا کہ جس سے شہر کی چھوٹی نسل مستفید ہوگی۔ اور بلدیہ شہر کی تعلیمی ترقی میں بالواسطہ شریک کار ہوگی۔ اس مضمون کے اختتام پر مولوی سید محمد احسن صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل۔ بی۔ ویل۔ ہائی کورٹ، رکن مجلس بلدیہ رکن مجلس وضع قوانین نے حسب ذیل تحریر پیش کی۔

”اس کانفرنس کی رائے میں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے

تحت ایک ذرا ممتی کالج کا افتتاح جلد عمل میں لایا جائے“

نواب سید محمود علی شاہ صاحب نے اس تحریک کی تائید کی اور بیان کیا کہ

جناب صدر خواتین و حضرات!

مجھے آج یہ اہم کام سپرد کیا گیا ہے کہ میں جناب مولوی سید محمد احسن صاحب بی۔ اے، ایل بی، ایل بی وکیل کی تحریک کی تائید کروں۔ آپ حضرات کو اس کا بخوبی علم ہے کہ ہمارے ملک میں دو ہی ذرائع معاش ہیں۔ ایک ملازمت اور دوسرا زراعت۔ ان ذرائع میں زراعت کا درجہ بہت ہی اہم ہے۔ کیونکہ زراعت ہی پادامی کی زندگی کا دار و مدار ہے اس لئے زراعت کی جانب فوری توجہ کرنیکی سخت ضرورت ہے۔ اس کے ماسوا ہمارا ملک زیادہ تر زراعتی ذرائع رکھتا ہے خصوصاً اضلاع تلنگانہ و مرہٹواری کی کل زمینات زراعتی کاموں ہی میں کام میں لائے جاتے ہیں۔ موجودہ طریقہ زراعت ایک زمانہ قدیم سے جاری ہے مگر ضروریات زندگی میں روزانہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور موجودہ طریقہ سے جو زراعت ہوتی ہے وہ اس قدر مال فراہم نہیں کر سکتی جو کافی ہو سکے اور اسی قسم کے طریقہ میں بہت دقت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور اچھے جانوروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں اگرچہ کہ اس وقت افزائش نسل چوپایہ کی معقول کوشش کی جا رہی ہے لیکن باغفل وہ ضرورت کے لحاظ سے ناکافی ہے اس لئے جدید آلات کے ذریعہ زراعت کی جانے کے لئے ایک زراعتی کانٹریک کی ضرورت ہے تاکہ موجودہ کاشتکار جو صرف قدیم طریقہ سے زراعت کرتے ہیں انکی اولاد تعلیم پا کر زمانہ حال کے ایجاد شدہ آلات و فن زراعت سے واقف ہو کر زراعتی کلم انجام دے سکے اور اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ جاگیردار صاحبین بھی زراعتی تعلیم حاصل کریں تاکہ اپنی جاگیر میں زراعت کو ترقی دے سکیں جب کہ وہ خود فن زراعت سے واقف ہونگے تو اپنی رعایا کو بھی فن زراعت سے واقف کرا سکیں گے جس سے انکی جاگیرات کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو سکیگا اور ان کی رعایا زراعت اچھی طرح کر کے اطمینان سے زندگی بسر کریں گی۔

اس لئے مجھے مولوی سید محمد احسن صاحب کی مفید تحریک سے کمال اتفاق ہے اور میں ان کی تحریک کی تائید کرتا ہوں۔

تحریک بالاتفاق منظور ہوئی، التحریک کے منظوری کے بعد ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔ اے بی بی ریج ڈی (لندن) بیرسٹرا ایٹ لاء نے ”خیالات کا اثر قسمت پر“ کے عنوان سے حسب ذیل مقالہ پڑھا۔

خیالات کا اثر قسمت پر

گرد دل تو گل گزر دگل باشی و بیل بقر اربسل باشی
تو بزوی حق کل است گر رو بچند اندیشہ کل بیشہ کنی کل باشی (جانی)

خیالات ہی سے مقاصد و غایات کا تعین ہوتا ہے، مقاصد کردار، افعال و اعمال میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، افعال ہی کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے، عادات کی تعلیم و تربیت سے سیرت تشکیل پاتی ہے اور سیرت ہی ہماری قسمت کا تعین کرتی ہے، جیسی سیرت ویسی قسمت، لہذا جیسے خیالات ویسی کائنات، انا محمد ذلن عبدی بی۔“

یہ قانون ذہن کے دائرہ میں وہی صداقت و اہمیت رکھتا ہے جو قانون تجاذب و دائرہ فطرت میں معنی یقینی و قطعی ہے۔ جب سیرت و قسمت کی تشکیل و تعین میں خیالات ہی کی کار فرمائی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لئے اپنے خیالات کی اصلاح اس کا اپنا نہایت اہم فریضہ ہے۔ قوم سازی اور فرد کی روح کی تکمیل و درستی خیال پر منحصر ہے موقع کی اہمیت کے لحاظ سے یہ جاننا ہوگا کہ اس موضوع پر میں یہاں اپنے چند خیالات کا اظہار کروں۔

مقاصد و غایات کا دائرہ ذہن انسانی ہے۔ انسان کا کوئی فعل مصلحت و فائدہ سے خالی نہیں ہوتا۔ اب مقاصد کا تعین غور و فکر، سوچ و چار پر منحصر ہے غور و فکری کائنات کی سب سے زیادہ عظیم شان قوت ہے اور یہی ان دونوں انسان میں سب سے زیادہ غریب تربیت یافتہ قوت ہے۔ اس کی تربیت ہی کے متعلق بچے یاں کچھ کہنا ہے۔

فرض کیجئے کہ آپ کو ایک باغ لگانا ہے۔ یہاں آپ کو چند قوانین پر عمل کرنا ہوگا جن کو باغبانی کے قوانین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلی چیز تو یہ دریافت کرنی ہے کہ باغ لگانا کہاں جائے، پھر اس جگہ کو سطح اور خس و خاشاک سے پاک کرنا چاہیئے۔ یہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ پھر یہیں بھولوں یا ترکاریوں کے بیج کا انتخاب کرنا چاہیئے اور اس مددگی سے تیار کی ہوئی زمین میں انہیں بونا چاہیئے ہیں اس امر کا بھی خیال ہے کہ بیج عمدہ ہیں ناقص نہیں۔ پھر موسم گرما میں ان بیجوں کو پانی دینا پڑتا ہے تاکہ شدت تمازت انہیں جلانہ ڈالے۔ ابھی ان انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وقت مقررہ گزر جائے اور بالآخر فصل تر و نمائی کرے اگر بے مبری سے ہم بیجوں کو کھود کر دیکھنا چاہیں کہ یہ بل تو نہیں گئے تو پھر ان بیجوں کو نٹوٹنا کا موقع نہیں ملے گا۔ بعض دفعہ ہمیں کچھ زیادہ دن انتظار کرنا پڑتا ہے لیکن اگر ہم نے زمین کو خس و خاشاک سے اچھی طرح پاک کیا ہے، بیجوں کے انتخاب میں غلطی نہیں کی، آبیاری کی

ہے، تو یہ یقین ہے کہ ایک دن زندگی دامن زمین چیر کر پودوں کی شکل میں جلوہ افروز ہوگی؛ اسی زمانہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بادباراں، آفتاب و حرارت بیجوں کے نشوونما کے لئے ضروری ہیں، طوفان تک نہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے، عناصر ان کے دشمن نہیں، ساری کائنات اور کائنات کی ساری قوتیں ان کے ساتھ ہنر عمل کر رہی ہیں !

فرض کرو کہ انتظار کی مدت بھول گئی، باریک بیجوں نے خوش رنگ و دلفریب لالہ دیا من کی شکل اختیار کی، غفلت کا زبردست لیکن مانوس مجذوبہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش ہوا۔ شروع ہی سے ہم جانتے ہیں، اور یہ علم مرتبہ یقین تک پہنچا ہے، کہ جس پھول کا بیج ہم نے بویا ہے وہی پھول والا پودا رونما ہوتا ہے، اور ہزار بار کیوں کے ساتھ اپنے اندر ان تمام چیزوں کا احادہ کرتا ہے جو اس پودے میں پائی جاتی ہیں جس کا بیج ہے، کیا اس بیج کو اصل پھول کی نہ بھولنے والی صورت یاد رہتی ہے ؟

پھول کی غایت تخلیق سے تو ہم واقف نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ ہمارے دل کا سرور، آنکھوں کا نور ہے، عرب کے کسی شاعر کی زبان میں ہم اس کو ”ریح قلبی نور بصری، جلا، حزنی، ذباب ہی“ کہہ سکتے ہیں۔ باغبانی کے یہ قواعد تو آپ سب جانتے ہی ہیں، کوئی بات نئی نہیں، لیکن میری دانست میں نئی بات جو میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بالکل انہیں قواعد و قوانین کے استعمال و پابندی سے آپ دنیا کی تمام حسین و خوش گوار چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں۔ جو زندگی کے بیج میں منور ہے وہی ہم میں سے ہر ایک میں موجود ہے، ان چیزوں کے حصول کے لئے ہمیں زندگی کی ویسی ہی خدمت کرنی پڑتی ہے جیسی کہ ان پھول کے بیجوں کی، ہم نے کی تھی۔

دلفریب پھولوں کے لئے آپ نے خارج (عالم اکبر) میں باغ لگایا تھا، شادمانی و مسرت کے حصول کیلئے آپ کو باطن (عالم صغیر) میں باغ کے لئے زمین تیار کرنی ہے۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ اس کا عمل وقوع ٹھیک کہاں ہے ؟ یہ باغ آپ کو اپنے ”میدان فکر“ میں لگانا ہے۔ کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے ہاں ایک عظیم الشان ”میدان فکر“ موجود ہے، جسکی وسعت کو ارض و سما نہیں پاسکتے، صرف ہمارا دل ہی اس کو سما سکتا ہے ! افسوس ہے کہ یہ میدان خس و خاشاک سے بٹا پڑا ہے ! جانتے ہو کہ یہ خس و خاشاک ہے کیا ؟ وہی سلبی خیالات جن کو مختصر طور پر غلط اور بد خیالات کہنا کافی ہے۔ واقفان راز کا اصرار ہے کہ یہی ہماری تمام مصائب و آفات کا سرچشمہ ہیں، ان سے ذہن کو پاک و صاف کرنا چاہیے، اس راز کو سمجھنے کیلئے اس نغیاتی قانون پر غور

کہ جس کا ہم نے ابتداء ہی میں ذکر کیا ہے۔ خیالات ہی پر ہم زندگی کے مقاصد کا تعین کرتے ہیں، اب یہ مقاصد ہی محرک بن کر ہمیں عمل پر آمادہ کرتے ہیں، اعمال کی تکرار عادات راسخہ کی قیام کا باعث ہوتی ہے، اور سیرت سوا ہے ان عادات راسخہ کے مجموعہ و تنظیم کے کوئی اور چیز نہیں، اور ہماری سیرت ہی ہماری قیمت کا دوسرا نام ہے سبلی خیالات فاسد مقاصد کا تعین کرتے ہیں، ان ہی سے تو شر کا صدور ہوتا ہے، شر کا ارتکاب عادات بن کر سیرت بد کی تشکیل کرتا ہے، اب میکا بھی طور پر شر ہی کا صدور ہونے لگتا ہے، اور شر کے نتائج و ثمرات سے ہم سب قفا ہیں، درد و رنج، غم و الم، حزن و یاس۔

میدان فشر کا سبلی خیالات کے خس و خاشاک سے پاک ہونا ضروری ہے اور نیک خیالات کی "تعم ریزی" لازمی۔ سبلی خیالات کو دور کرنے کا طریقہ ان سے جنگ کرنا نہیں، ان کا زور مردا فگن ہوتا ہے۔ جب ہم ان سے مقابلہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری ساری توجہ ان ہی کی طرف لگی ہوتی ہے۔ اب حیات ("یا چشمہ حیات") کا بہاؤ توجہ کی طرف ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر، اگر ہم کسی گناہ یا شر کی جانب توجہ کریں (اس کے استیصال کی خاطر ہی) تو زندگی کی تمام قوتیں اس کی جانب رخ کرتی ہیں، اس طرح اس کی طاقت میں اور اضافہ ہوتا ہے مثلاً اگر ہمین بخوا کا مرض ہے تو ہم جس قدر اس کے متعلق فکر کریں گے اور اس کو دور کرنا چاہیں گے، بالفاظ دیگر، اس کا مقابلہ کریں گے اسی قدر یہ تکلیف زیادہ ہوتی جائیگی۔ اس کے برخلاف اگر ہم اس کو بالکل بھول جائیں تو ہم تھنڈی نیند سو جائیں گے اسی طرح شر کے مقابلہ سے اس کی طرف توجہ ہوتی ہے، اور توجہ سے اس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

شر کا مقابلہ، خیر سے کرنا چاہیے، ظلمت کا مقابلہ نور سے، ظلمت کو دور کرنا ہو تو نور کو داخل کرنا چاہیے، ظلمت کا ظلمت سے کرنا "ظلمات فوق ظلمات" کا مصداق بنتا ہے۔ اگر تمہیں نفرت کو دور کرنا ہو تو محبت کا تصور کرو خوف کو دور کرنا ہو تو شجاعت و بہمت پر نظر جاؤ۔ خود غرضی کے بجائے ایثار نفس کا خیال رکھو، اسی طرح تمہیں غصہ کی بجائے حلم، بیماری کی بجائے صحت، کج خلقی کی بجائے خوش خلقی، شکایت کی بجائے صبر و شکر، خلق کی جہبائی کی بجائے رازق مطلق کا خیال اپنے ذہن میں جانا چاہیے۔ تمہارا معروض فکر جو گافہ رفتہ رفتہ وہی تم بھی بن جاؤ گے، یہی معنی ہیں جاتی سامی کے اس شعر کے جکا او پر ذکر ہوا۔

گرد دل تو گل گزند گل باشی درین فیصلہ ریل باشی

سولنائے روم نے اس کو اس طرح ادا کیا تھا۔

اے برادر تو ہیں اندیشہ مابقی استخوان دریشہ

گر گلستانِ نیشہ تو گلشنی در بود خاکے تو ہمہ گلشنی !

اسی فکر کے ایک دوسرے اعتبار پر غور کرو۔ دنیا میں وہی چیز بری ہے جس کو ہم برا سمجھتے ہیں۔ اگر ہم اس کو برا نہ سمجھیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمارے جسم کو آزاد پہنچائے۔ کہیں وہ ہمارے قلب کو چھو نہیں سکتی، یاد رکھو دنیا میں ہر چیز کی قیمت رائے پر منحصر ہے اور رائے تمہارے اختیار میں ہے جب چاہو رائے کو ترک کر دو۔ پھر اس طاع کی طرح جس نے اپنے جہاز کو خطرناک سمندری پہاڑیوں سے بچا نکالا ہو، تمہیں ہر طرف سکون نظر آئے گا! ”اگر تم اپنی رائے کو ترک کر دو تو پھر یہ شکایت باقی نہ رہے گی کہ لمبے مجھے نقصان پہنچا، اس شکایت کو ترک کر دو کہ مجھے نقصان پہنچا تو نقصان خود باقی نہ رہے گا۔“ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ”عقلند آدمی کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ کسی خوش قسمتی کا محتاج نہیں۔“

خیالات کا ماحول برا اثر ناقابل انکار ہے۔ خیالات کی پختگی اور قوت انسان کی روح کو سخت جسمانی تکلیف میں بھی مطمئن اور قوی رکھ سکتی ہے۔ ارادہ نتیجہ ہے توجہ کا یعنی خیال و فکر کا جن خیالات کا اظہار انسان عمل میں کرنا چاہتا ہے ان ہی پر توجہ کو مرکوز کرتا ہے ان ہی کو ذہن میں دہراتا ہے۔ الثابت ملتا ہے، ان ہی سے اس کے ذہن کی فضا مملو ہوتی ہے، اور یہی خیالات عالم آثار میں عمل کی صورت اختیار کرتے ہیں، خیال حقیقت ہے عمل اس کا ظہور ہے۔ اسی لئے تو ولیم جیمز نے کہا تھا کہ ”زندگی کا سارا ڈراما ایک ذہنی ڈراما ہے، ساری شکل ذہنی شکل ہے۔“ یہ قول صدق محض ہے !

میدانِ فکر کو خس و خاشاک سے پاک کر کے نیک خیالات کی تخم ریزی کرو جس طرح باغبانی کے وقت بیجوں کے انتخاب میں احتیاط کی تھی۔ اسی طرح یہاں بھی خیالات کے انتخاب میں نہایت حزم و احتیاط ضروری ہے اور جس طرح بیج کو پودے کی شکل میں نمایاں ہونے کے عرصہ لگاتا تھا اور تمہیں انتظار کرنا پڑتا تھا، اسی طرح خیالات کو عمل میں ظاہر ہونے بغیر دفعہ دیر لگتی ہے، تمہیں بہت ہمت نہ ہونا چاہیے اور نہ رنجیدہ، اگر تم نے اپنا کام قاعدہ کے موافق کیا ہے، خس و خاشاک کو صاف کیا ہے نیک خیالات کے ہونے میں احتیاط برتی ہے تو شادمانی و مسرت طایفہ و برد قلبی، سرور و کیف وہ گہائے شاداب ہیں جو نتیجہ کے طور پر تمہیں حاصل ہوں گے۔

ان حقایق سے واقف ہونے کی وجہ سے عقلند جانتا ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں۔ اگر اس کا کوئی دشمن ہے تو خود اس کا نفس ہے ”اعدی عدو کا لفظی معنی ہے“ اس لئے وہ نہ کسی پر ملامت کرتا ہے اور نہ کسی کی مذمت۔ برد قلبی کے ساتھ محاسبہ نفس کرتا ہے۔ صبر و سکون کے ساتھ اپنا اخلاقی فرض ادا کرتا ہے

صرف یہی نہیں کرتا بلکہ کسی مزید قرض میں مبتلا ہونے سے ہذر کرتا ہے۔ وہ اپنے خیالات پر نظر رکھتا ہے اور اپنے
 خیال کو بے عیب بناتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حال قیوہے اضی کا قسمت قیوہے خیالات کا!!

کال گوید جہاں تمام وہاں است ناقص گوئیکو تہ است ہاں است
 خلق ہاں، عرصہ ہاں است ہاں این دن با حسن ز طم وہاں است سبائی است آبادی
 اس مقالہ کے ختم ہو جانے پر تحریک مندرجہ ذیل پیش ہوئی،

”اس کا نفرش کی رائے میں ملک کے موجودہ طرز تعلیم میں تبدیلی پیدا
 کر کے صنعت و حرفت کی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر انتظام کرنے سے قبل اس
 بات کی سخت ضرورت ہے کہ ملک کی صنعت و حرفت کی ترقی کے
 ذرائع معلوم کر لئے جائیں اور حرفتی میدان کے وسیع ہونے میں محسوس
 ہیں اور انہیں فتح کرنے کی کوشش کی جائے۔“

مولوی محمد کرم الدین صاحب انصاری بی۔ اے ال ال بی وکیل ایگورٹ نے اس تحریک کو پیش کرتے ہوئے
 جو تقریر کی وہ درج ذیل ہے
جناب صدر و معزز حضرات!

بہت زمانہ نہیں گزرا کہ ہمارے پاس حکومت تھی، علم تھا اور دولت بھی تھی لیکن جب ہم پر ادا بار آتا تو حکومت
 کے ساتھ ہی دولت و علم نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ ہم روز بروز فقر و غارتگی میں گرتے گئے لیکن ہر چیز کی ایک وجہ ہوتی
 ہے۔ تحت التری میں جب ہمارے قدم ٹکے تو ہمیں پھر ابھرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن حکومت اور دولت و علم کو ساتھ
 ہی جہاں ہماری بہت سی خوبیاں ذرا اکل ہو چکی تھیں وہیں صحیح فکر و عمل کا مادہ بھی ہم میں سے مفقود ہو گیا تھا۔
 ہم نے اپنے اسباب مذلت پر غور کرنا شروع کیا تو ایک آواز بلند ہوئی کہ ہمارے تمام امراض کا واحد علاج
 تعلیم ہے اور ہر گوشہ سے بھی صدا آنے لگی کہ تعلیم ہماری مصیبتوں کا بیڑا پار کر دیگی لیکن اجتہاد کی اہمیت ہم میں
 باقی نہیں تھی اس لئے مجبوراً ہم تقالی کرنے لگے اور تعلیم کے ایک غلط راستہ پر چل پڑے اس معاملہ میں ہم
 نے اتنا فلو کیا کہ نہ صرف لڑکوں کو اس راستہ پر چلایا بلکہ اندھا دھند ایک ہی لاشی سے لڑکیوں کو بھی اسی راستہ
 پر لٹک دیا۔ راستہ جو کہ غلط تھا اس لئے بہت جگہ ٹھوکر کا لگنا ضروری تھا۔ ٹھوکر لگی اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ تعلیم تو
 ہمیں ٹھوکر کے سوا اور کچھ نہیں بتاتی ہے اور ممکن ہے کہ ہمارے مصائب کا واحد علاج تعلیم ہو لیکن کم از کم اس

قسم کی تعلیم ہمارے مصائب کا علاج کرنے کی بجائے الماد بوری ہے۔

کہا جائے کہ پنجاب یونیورسٹی کے جلد تعلیم استاد میں سے پہلے یہ صدا بلند ہوتی ہے کہ ہمارے مصائب کا واحد علاج تعلیم نہیں بلکہ حرفتی تعلیم ہے اس کی صدائے بازگشت ہمیں ملک کے اور گوشوں سے بھی سنائی دے رہی ہے۔ یوپی میں سپرد و کھنی میں اس بات پر زور دیا گیا ہے۔ سی۔ پی۔ میں ودیا مندر اسکیم کا اہم جزو بھی ہے کہ تعلیم کا آغاز عملی تعلیم سے کیا جائے۔ حیدرآباد میں میکٹری اسکیم کا نشا بھی یہی ہے کہ ہمارے مدارس میں تعلیم کو بڑی حد تک حرفتی رنگ دیا جائے۔ ہم ایک دفعہ غلط راستہ پر چل کر ٹھوکر کھا چکے ہیں نیشنل شہور ہے کہ دودھ کا جلا جھاچہ پھونک کر پیتا ہے۔ لیکن سلوم ہوتا ہے کہ ہماری آنکھیں نہیں کھلی ہیں اور ہنوز ان میں غار باقی ہے۔ اس بات پر خوب اچھی طرح غور کرنے کی ضرورت تھی کہ عام حرفتی تعلیم کس حد تک ملک کے لئے خوشحالی کا باعث ہو سکتی ہے اور ملک میں حرفتی ترقی کے کیا امکانات ہیں ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب دوسری ٹھوکر سے ہماری آنکھیں کھلیں تو ہم محسوس کریں کہ گڑھے سے نکل کر ہم کوئیں میں گر پڑے ہیں۔ موجودہ طریقہ تعلیم کا نتیجہ ہے کہ ہم میں اربوں ٹھوکر پیدا ہو گئے ہیں اور ان کے لئے ذریعہ معاش مفقود ہے لیکن اس طرح سے تعلیم پایا ہوا شخص جو ابھی کیوں نہ ہو کم از کم اس قدر اطمینان تو رکھتا ہے کہ میری تعلیم گو میرے لئے ذریعہ معاش نہیں سکی لیکن آخر علم کی فی نفسہ بھی کچھ قدر قیمت ہے۔ اس تعلیم نے کم از کم مجھ میں تہذیب نشا انگلی اور جلا تو پیدا کر دی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر حرفتی تعلیم کی اسکیم کامیاب نہ ہو سکی تو نتیجہ یہ ہو گا کہ اموقت تو تعلیم یافتہ لوگ صرف اتھ میں قلم لئے ہوئے بیکار بھر رہے ہیں لیکن حرفتی تعلیم کے بعد طلبہ کو نجاری اور لوہاری کے اوزار کا تھیلا سر پر لا کر بیکار بھڑا بیٹا لگا اور ان کے لئے ایسا کوئی اطمینان بھی نہ ہو گا کہ ہمارے فن کی فی نفسہ کوئی قدر و قیمت ہے یا ہمارے فن نے ہم میں کوئی جلا پیدا کر دی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان نئے حرفتی مدارس سے نکلنے والے طلبہ چند دنوں تک اسی قسم کے مدارس میں عملی وغیرہ کچے بیٹوں نہیں کھپ جائیں لیکن اگر ملک میں ان کے لئے کوئی حقیقی میدان نہ ہو تو بہت جلد وہ دن آجائے گا کہ حرفتی تعلیم پائے ہوئے طلبہ بیکار بھرنے لگیں اور انکی مایوسی موجودہ طلبہ سے کہیں بڑھی چڑھی ہوگی اور ملک کے لئے زیادہ تباہ حالی کا باعث ہوگی۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ عام حرفتی تعلیم کے میدان میں کوئی بڑا قدم اٹھانے سے پہلے ملک کی حرفتی ترقی کے امکانات پر کافی غور کیا جائے اور اس ترقی کے راستہ میں جو موانعات ہیں انہیں ہر ممکن طریقہ دور کرنے کی کوشش کی جائے اور اہل ملک کے لئے حرفتی ترقی کا حقیقی میدان پیدا کیا جائے۔ یہ غلط ہے کہ ہمارا ملک

صرف زراعتی تھا۔ یہ تاریخ ابھی بہت پرانی نہیں ہوئی ہے کہ دنیا میں ہم خام پیداوار کے لئے نہیں بلکہ اپنی مصنوعات کے لئے مشہور تھے ہماری صنعتوں کو تباہ و برباد کرنے ایک منظم کوشش کی گئی ہے اور اگر ہم انہیں پھر سے ترقی دینا چاہتے ہیں تو ہمیں ایک معین پالیسی کے تحت بہت زیادہ منظم کوشش کرنے کی ضرورت ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہماری حکومت ابھی اس جانب متوجہ نہیں ہے اور اس نقطہ نظر سے ابھی اسے غور اور عمل کرنے کا موقع نہیں ملا ہے ورنہ ہمارے کپڑے کے کارخانوں کی ناکامی اور ہمارے صابن سازی کے کارخانہ کی تباہی کی نوبت نہ آتی۔ ویسلاف کی صنعت کی ترقی کے امکانات کو ہم نے برٹش انڈیا کے مماثل ٹکس لگا کر ختم کر دیا۔ شکر سازی کی صنعت کی ہم ابتدا کر رہے ہیں لیکن ملکی شکر پریکٹس لگا کر شاید ہم اس کے لئے بھی روز بد دیکھنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ کاغذ سازی کی صنعت کے وسیع امکانات بتائے جاتے ہیں لیکن اگر ہم نے اس صنعت کے لئے بھی تائین کا انتظام نہ کیا تو کچھ مائل نہ ہوگا۔ غرض کہ یہ مسائل خود عمدہ ایک داستان میں جسکے سنانے کا یہاں وقت ہے نہ محل۔ بہر حال ہم حکومت پر وضع کر دینا چاہتے ہیں کہ تاؤٹیکلٹک کی حرفتی ترقی کی نسبت ایک مفید اور معین پالیسی مرتب کر کے اس پر عمل شروع نہ کیا جائے ملک کی عام تعلیم کو حرفتی رنگ دیدینا سخت خطرناک ہوگا۔

راجہ کرن پرشاد صاحب نے اسکی تائید میں یہ تقریر کی :-

جناب صاحب! اور معترضات حضرات !

قبل اس کے کہ میں اس تحریک کی تائید کروں مجھے اجازت دیجائے کہ اس کے متعلق اپنے چند خیالات کا اظہار کروں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ہم ایک ایک شے کے لئے ممالک غیر کے محتاج ہیں ہماری روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہم دوسرے ملکوں کا منہہ تکتے رہتے ہیں۔ قدیم صنعتیں تو قریب قریب ناپید اور مفقود ہو چکی ہیں۔ ان صنعتوں کو پھر زندہ کرنے کی کوشش ایک امید موہوم ہے لیکن اس سے زیادہ مفید اور امید افزا کام یہ ہوگا کہ ہم ایسی صنعتوں کو فروغ دینے کی کوشش کریں جن سے ہمارے ملک کو فایده البالی نصیب ہو، یوں تو دنیا کے سب کام چلتے رہتے ہیں مگر ان کاموں سے جو سوچ بچار کر لئے جاتے ہیں کچھ مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ چند سال پہلے میں لنکا کا سفر کر رہا تھا ایک اسٹریٹین سیاح میرا ہمسفر تھا دوران گفتگو میں مجھ سے پوچھنے لگا کہ وہ کونسی اشیاء ہیں جنکو آپ کا ملک اسٹریلیا کی پیداوار سے تباہ کر سکتا ہے۔ میں نے اس خیال کو مد نظر رکھ کر کہ ہمارا ملک زرمی پیداوار میں امتیاز رکھتا ہے بڑے فخر سے چند عمدہ پھلوں کے نام لئے

لیکن سیدی مایہ سی اور استعجاب کی کوئی انتہا نہیں رہی جب اس نے ہنس کر یہ جواب دیا کہ دنیا کا کوئی پہل ایسا نہیں ہے جسکو ہم نے مالک غیر سے آسٹریلیا میں منتقل نہ کر لیا ہو۔ جب ہماری زحی ترقی کا یہ حال ہے تو اس سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ صنعت و حرفت میں ہم کتنے پیچھے ہونگو اس لئے قبل اس کے کہ ہمارے ملک میں صنعت و حرفت کے بڑے بڑے درجے قائم کئے جائیں اور ہمارے ملک کے بچوں کو صنعت و حرفت کی تعلیم دینے کی ترغیب دی جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ملک کی صنعت و حرفت کی ترقی کے ذرائع معلوم کر لئے جائیں اور حرفتی میدان میں جو دشواریاں ہیں انہیں رفع کرنے کی کوشش کی جائے

مولوی شیخ چوہدری صاحب دکنی نے اس تحریک میں یہ ترسیم پیش کی کہ ”صنعت و حرفت کی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر انتظام کرنے سے قبل“ کے بجائے ”انتظام کرنے کے ساتھ“ کے الفاظ قائم کئے جائیں، مولوی محمد خیر الدین صاحب دکنی نے اس کی تائید کی، چنانچہ بالآخر اس ترسیم کے ساتھ تحریک مندرجہ ذیل صورت میں بالاتفاق منظور ہوئی۔

”اس کانفرنس کی رائے میں ملک کے موجودہ طرز تعلیم میں تبدیلی پیدا کر کے صنعت و حرفت کی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر انتظام کرنے کے ساتھ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ملک کی صنعت و حرفت کی ترقی کے ذرائع معلوم کر لئے جائیں اور حرفتی میدان کے وسیع ہونے میں جو دشواریاں ہیں انہیں رفع کرنے کی کوشش کی جائے“

اس تحریک کے بعد نظام العمل میں مولوی الحساج محمد اکبر علی صاحب مہتمم صحیفہ کا مقالہ ”عالم کی سیرت کا اثر متعلم“ کے موضوع پر شریک تھا لیکن مولوی صاحب موصوف بوجہ علالت پھلی بندر میں مقیم تھے، اور بذریعہ ٹیلیگرام اپنی عدم شرکت کا افسوس اور کانفرنس کی کامیابی کی توقع ظاہر کی۔ گو انہوں نے اپنا مقالہ بھیج دیا تھا لیکن صدر صاحب نے فرمایا کہ مقالہ کے سننے کا اصلی لطف اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا جب کہ خود صاحب مقالہ سے ہم یہ مقالہ سماعت کرتے، صدر صاحب نے توقع ظاہر کی کہ آئندہ انشاء اللہ خود صاحب مقالہ سے اس مقالے کو سننے

کا موقع بہت ہو گا۔

اب : لہذا نظام ہمسل ہو وی محمد سلطان صاحب منشی فاضل نے مختصر نذر کے ساتھ تحریک زندگی

ذیل پیش کی

” اس کانفرنس کی رائے میں سینا مینی کے برے اثرات سے طلبہ کو محفوظ رکھنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ تعلیمی فلسفے کے علاوہ باقی فلسفے میں ۱۶ سال سے کم عمر کے طلبہ کا دخل بذریعہ قانون ممنوع قرار دیا جائے“

آرستانا ائن صاحب بی بی سی آنرز (سندھ) نے اس تحریک کی تائید کی اور کہا کہ جناب صلا !

” میرے پیشرو نے اس دزدیوشن کے مقاصد پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ میں اس کے تائید میں صرف دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ

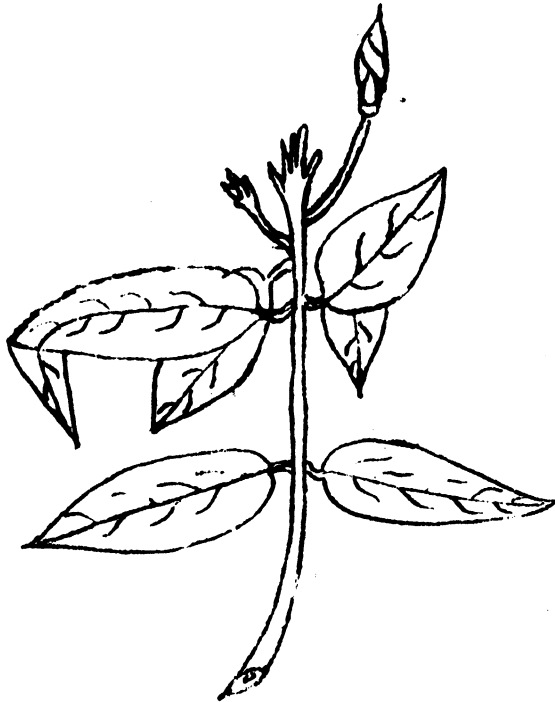
۱۔ دوسرے ممالک مثلاً انگلستان میں سینا مینی کے متعلق اس قسم کے عمر کی قید کے قواعد موجود ہیں یہ زنا زبام انگلستان میں ڈاکٹر جے کال اور مسٹر ہانسڈ کے تصاویر میں سولہ سال سے کم عمر کے اشخاص کو اجازت نہیں تھی۔ ان کا مقصد تو یہ تھا کہ چونکہ یہ تصاویر بیک ہیں اس لئے کم عمر لوگوں کو ان کے دیکھنے سے منع کیا جائے۔ مگر ہمارا مقصد تو سینا مینی سے جو برے اثرات اخلاق و اطوار پر ہوتے ہیں ان کو رو کرنا ہے لہذا ہم کو اس قسم کے قواعد کی زیادہ ضرورت ہے اور قواعد زیادہ سخت ہونا بھی لازمی ہے۔

۲۔ سولہ سال کے طالب علموں کی حد تک دزدیوشن محدود ہے مگر طالب علم کے نقطہ کے معنی بہت وسیع ہیں کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ مفقربہ ابتدائی تعلیم عام اور لازم ہو جائیگی تو یہ قانون تمام ان لوگوں پر عائد ہو گا جن کی عمر سولہ سال سے کم ہو۔ ہمارے کانفرنس کے مقاصد میں بھی چونکہ اخلاقی اور تعلیمی نقطہ نظر سے تمام پسندوں پر بحث کرنا شامل ہے لہذا یہ قانون بھی تمام سولہ سال سے کم عمر لوگوں پر عادی ہو گا قطع نظر اس کے کہ ان کو تسلیم اور اس کو سولوں سے کوئی راست تعلق ہو یا نہ ہو۔

تحریک بالاتفاق منظور ہوئی۔

اس تحریک کے منظور ہونے کے بعد ڈاکٹر عبدالحی صاحب پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ و معتمد انجمن ترقی اردو نے ایک مختصر تقریر کی اور کہا کہ اس کانفرنس نے اپنے ابتدائی دور میں بہت کچھ کام کیا تھا اور اب اس نئے عرصہ کے بعد کروٹ لی ہے اس دوران میں ہر جگہ حالات بدل گئے ہیں۔ ہر جگہ ہر قوم اپنے بچاؤ اور اصلاح کی فکر میں ہے اگر یہ کانفرنس کام پھر آغاز کرے تو اس کی سودمندگی میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا اس کانفرنس نے گزشتہ زمانہ میں بہت سارے طلبہ کو امداد دی ہے یہ امداد توسیع اور ترقی تعلیم کے مقصد سے دی گئی تھی یہی مقصد اب اور زیادہ دہشت چاہتا ہے۔ ضرورت ہو کہ کانفرنس اب اس جانب توجہ کرے اور جہاں تک ہو سکے خواہ وہ لوگوں کے بڑھانے کی فکر کرے۔

اس تقریر کے بعد اجلاس دوم بغیر و خوبی ختم ہوا اور شب میں مولوی خواجہ محمد احمد صاحب آئے ہتم عجائب خانہ نے تمدن قلب شاہیہ پر ہندی ملی مناظر کے ساتھ ایک گفت و شنید کی۔



اجلاس سوم

روز جمعہ ۱۳ مہر ۱۳۴۷ء

۹ بجے اجلاس سوم شروع ہوا اور ابتداً مولوی غلام دستگیر صاحب رشید ام۔ اے۔ لکچرار فارسی نظام کالج نے تحریک ذیل پیش کی۔

لایہ کا نفرین اپنی سابقہ تحریک پر کہ ڈرائنگ کی تعلیم کے ساتھ خوش نویسی کی تعلیم کا بھی مدارس سرکاری میں انتظام عمل لایا جائے مگر توجہ دلاتی ہے۔

اس تحریک کو پیش کرتے ہوئے محرک نے کہا کہ
جناب صدر!

ع ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود مین۔

حسن کے باب میں یہ کس قدر اعلیٰ اور بلند تخیل ہے۔ سچ ہے حسن اور لطافت ہر جگہ اور ہر کام میں مطلوب ہیں۔ یہی حال خوشنوی اور حسنِ کتابت کا ہے۔ سب کو یہ طلب ہے کہ لکھنے والے کا خط اچھا ہو۔ صفائی اور ستمرائی کا تو کم از کم مطالبہ ہوتا ہے۔ اس سے ممتحن، طالب علموں، دفتروں، کتابوں، نقل نویسیوں غرض ایسے سارے متعلقہ جماعتوں کی آسانیاں وابستہ ہیں۔

یوں تو فنون لطیفہ کی زندہ قوموں میں بڑی قدر ہوتی اور ان کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے لیکن اگر کوئی فن لطیف انفرادی اور قومی زندگی کے روزمرہ کاموں میں کوئی خوبی اور حسن پیدا کر دے تو پھر اسکی طرف غیر معمولی توجہ کی جاتی ہے۔ یہ صفت قوم کے مذاق سلیم کا معیار قرار پاتی ہے۔

خوشنوی کا حال دیکھئے، انسان کی روزمرہ ضروریات جس قدر اس فن لطیف کو تعلق ہے۔ کسی اور فن لطیف کو نہیں۔ حسنِ کتابت ایک لکھے پڑھے آدمی کی تحریر میں ظاہر ہوتا ہے۔ قوم کے حسنِ مذاق کو ہر آن ظاہر ہونے کا موقع ملتا ہے۔ عملی فائدے اس کے علاوہ ہیں۔ روزمرہ ضروریات میں نہ تو سیفقی کو، دھماح ہے اور نہ ڈرائنگ کو۔ پیر جوں جوں

تعلیم وسیع اور عام ہوتی جاتی ہے۔ خوش خلی کی ضرورت اور اہمیت کی عمومیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔
کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے مدارس میں ڈرائنگ کا لزوم ہو، اسکا عام انتظام ہو۔ لیکن خوش خلی
کی تعلیم عام اور لازم ہو۔

اردو میں ہماری طباعت عام طور پر لیتھو کی ہے۔ اعلیٰ اور حسین کتابت کی کمی کی عام شکایت ہے ہماری طباعت
اس کمی کے باعث بدنام ہے۔ پھر کتابوں سے غلط نویسی کی بڑی شکایت ہے۔ شکوہ میں بطور مثال اور شبہ کا تہذیب
کی حکایت ہے۔ اس میں صرف کتابوں ہی کا قصور نہیں۔ بلکہ مصنفین بھی برابر کے ذمہ دار ہیں۔ خود ان کا غلط ہنر
خراب ہوتا ہے۔

صحافت، جربہ و بھکاری، تعصیف اور تالیف کی ترقی کے ساتھ ساتھ خوش خط اہل فن کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے
بہت کم فنون لطیفہ ایسے ہیں جن کی مانگ اور طلب کا بازار اس قدر وسیع ہو۔ اس پر بھی اسکی تعلیم کی طرف توجہ نہ کرنا
قیمتی موقع کو ضائع کرنا ہے۔ دولت کا ذریعہ کھونا ہے۔

تعلیم یافتہ بے روزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے میں اس فن کی تعلیم معاون اور مددگار ہے۔ تعلیم یافتہ خوشنویس
زیادہ کامیاب ہوں گے۔ شریف پر وہ نشین عورتوں کے لئے ہنرمندی کے علاوہ آمدنی کا کفایت باعث ذریعہ ہے۔
با احساس قومیں اپنے اپنے فنون اور آرٹ کو کس قدر محفوظ رکھتی ہیں۔ عظیم الشان آرٹ جس کی قدردانی اور ترقی
میں اہل دکن نے اپنی سرپرستی اور قدر شناسی سے بڑا حصہ لیا ہے۔ بے توجہی سے زوال پذیر ہی نہیں بلکہ ضائع ہو چکا
ہے۔ اگر اس کی تعلیم عام ہو جائے تو پھر خصوصی ذوق رکھنے والے ایسے اہل فن بھی پیدا ہو جائیں گے جو اس فن لطیف
کی اعلیٰ روایات کو زندہ کر دیں گے۔

اس فن کی کئی شاخیں ہیں جن سے تہذیب اور زینت کے کئی کام لئے جاسکتے ہیں۔ خطا کو فی حالیہ طرز تعمیر
میں زیب و زینت بڑھانے کے لئے نہایت موزونی سے کام دیتا ہے۔ طرز نویسی ایک مستقل فن ہے۔ آرٹسٹ مکان
میں یہ ایک مستقل ہنر کی جگہ لے سکتا ہے۔ مساجد، عبادت گاہیں وغیرہ میں اس سے بڑے بڑے کام لئے جاتے ہیں۔
اعلیٰ حضرت بندگان عالی مظلہ العالی کو اس فن شریف و لطیف سے بڑی چسپی ہو، امید ہے کہ محکمہ تعلیمات کی توجہ سے یہ تحریر
رومیل آئے گی۔ اور حضرت اقدس واعلیٰ کے اس ذوق لطیف کی دائمی یادگار ہوگی۔

اس تحریر کی بانیہ مولوی خواجہ محمد احمد صاحب ام۔ اسے متمم عجائب خانہ نے کی اور بیان کیا کہ
جناب صدر!۔ خوشنویسی کو مسلمانوں نے ایسی ترقی دی کہ اس کو فنون لطیفہ کے درجے پر پہنچا دیا۔

جو حضرات مشرقی فن نقاشی کے دلدادہ ہیں وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مشرقی نقاشی کی اصل جان خطوط و کھال کے ساتھ کھینچنا ہے اور ان کے آثار چڑاؤ اور روانی میں وہ انداز پیدا کرنا ہے جو روح پر مختلف قسم کی کیفیات طاری کر دے۔ چونکہ مذہب اسلام بت پرستی کے خلاف زبردست رد عمل تھا اس لئے یہ ضروری تھا کہ سنگ تراشی اور مصوری کو ناجائز قرار دیا جائے۔

مسلمانوں نے فنون لطیفہ کے ارتقا میں زبردست حصہ لیا اور ان کے اس ذوق کا نتیجہ یہ نکلا کہ ذی روح کی اشکال بنانے کے بجائے خطوط کے ذریعہ حروف میں حسن پیدا کرنے کی پے در پے کوشش جاری رہی جس کے ذریعہ مختلف رسم الخط پیدا ہو گئے اور ہر رسم الخط کو ایسے اعلیٰ معیار پر پہنچایا گیا کہ اس کی نظیر اسلامی ممالک کے سوا دوسری جگہ نہیں ملتی۔

حقیقت میں یہ بڑا ستم ہے کہ نقاشی کو مصوری کی حد تک مقید کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر موسیقی کو لیجئے جو حضرات اس فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ غزل کا کر سنا دینا اس قدر دشوار نہیں ہے جتنا کہ فن کی کوئی چیز سنانا ہے۔ جو صاحب فنی چیز سننا چاہتے ہوں تو الفاظ کی خوبی اور معنی کے حسن سے ان کو بے نیاز ہو جانا چاہئے۔ فن داں کے لئے بے معنی الفاظ بھی جادو کا اثر رکھ سکتے ہیں بشرطیکہ ان کو اصول کے مطابق تان کے آثار چڑاؤ کے ساتھ گایا جائے۔ اس مثال سے میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ نقاشی اپنے حسن کے انہار کے لئے مضمین چہروں اور ذی روح اجسام کی محتاج نہیں۔ بلکہ حروف اور الفاظ کے لکھنے میں بھی اس کی رعنائیاں نہایت خوبی کے ساتھ ظاہر ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ عماد نے نستعلیق خط کے لکھنے میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ اگر اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک رباعی شاہ جہاں باہ شاہ کی خدمت میں پیش ہو جاتی تو پیش کنندہ ایک صدی کا منصبدار بنا دیا جاتا۔ نصف صدی پہلے تک خطاطی کو شرافت کا امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ سپہ گری اور دیگر فنون و علوم کو سکھنے کے ساتھ ساتھ شریف زادوں کے لئے ضروری تھا کہ اس میں بھی کافی دستگاہ پیدا کریں۔ اس فن کو سکھانے میں جہاں دوسرے فائدہ نظر تھے وہاں یہ بھی خیال تھا کہ اس کے ذریعے طبیعت میں بالواسطہ صفائی پاکیزگی۔ مناسب۔ حتیٰ کہ نقطہ کو بھی اس کے مقام پر رکھنے کا مادہ پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قدیم مصنوعات اور اثری یادگاروں میں یہ تمام چیزیں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں جہاں اس فن سے بدذوقی پیدا ہوئی اور زندگی کے تمام شعبوں سے یہ محاسن معفو و ہونے لگے۔ پُرانے خطوط کو دیکھئے کس قدر جاذب نظر ہوتے تھے کہ آج دن کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ اور آج کل کی مطبوعات کو دیکھئے کہ ان کو دیکھ کر ہمدردان قوم چلا اٹھتے ہیں کہ ہم اس زمانے میں اہل پرپ سے کتنے

مجھے ہیں۔

بدقسمتی سے ہماری مطبوعات میں کثرت سے غلطیاں رہ جاتی ہیں مصنفین نے اپنا وطیرہ بنایا ہے کہ مقدمے میں چند سطریں مطبع اور کاتب پر لکھتے ملامت کرنے کے لئے مخصوص کر دی جائیں اور اس کے ذریعہ تمام غلطیوں کا ذمے دار دو گنہگار ہستیوں کو قرار دیا جائے۔ لیکن مصنفین مجھ کو معاف فرمائیں اور بالخصوص وہ جو یہاں تشریف رکھتے ہیں کیونکہ ان کے متعلق تو مجھ کو یقین ہے یہ عرض کرنا چاہئے کہ ان کا خط نہایت پاکیزہ ہو گا۔ لیکن عام طور پر آپ کو یقین دلانا ہوں کہ کتابت میں خود فیصد غلطیاں محض اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ غریب کاتب باوجود سخت کوشش کے بھی فاضل مصنفین کی تحریر صحیح پڑھنے سے قاصر رہتا ہے۔

اب میں آپ کی توجہ آخری چیز کی جانب منطقت کرانا چاہتا ہوں۔ بدقسمتی سے ہماری ایک تنگی ہوئی جماعت خواہ وہ تعداد میں کتنی ہی کم کیوں نہ ہو یہ چاہتی ہے کہ رومن رسم الخط ہماری زبان کے لئے بھی اختیار کر لیا جائے تاکہ طباعت میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ حل ہو جائیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ رومن رسم الخط اختیار کرنے سے بھی ہم کو ہمارا مقصد کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ یہاں میں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس قوم نے کوئی سے نسخہ ثالث۔ ریحان تعلیق بستی تعلیق اور اس کے علاوہ اور کئی رسم الخط ایجاد کئے ہوں اگر اس فن سے اس کا ذوق باقی رہتا تو کیا وہ آج اپنی مشکلات کا کوئی حل بیان کر لیتی۔ اس بد فوئی کو دور کرنے کا اب سب سے زبردست ذریعہ صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ ہم اپنے مدارس میں اس فن کی تعلیم کو لازمی قرار دیں تاکہ اس سے بے التفاتی کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کا سدباب ہو سکے۔ کیا خوب ہوتا اگر جامعہ عثمانیہ کے تحت اس فن کی ایک اکاڈمی قائم ہوتی جس کے ذریعہ مشرق کے سب سے بہتر اور ممتاز فن لطیف کو تباہ ہونے سے بچایا جاتا اور اس کے احیاء اور ترقی کی صورت پیدا ہوتی لیکن اس وقت تو میں مجبور ہوں کہ اپنے محترم دوست مولانا رشید صاحب کی تائید پر اکتفا کروں بعد ازاں یہ تحریریک بالاتفاق منظور ہوئی۔

اب ڈاکٹر وحید الدین صاحب پی۔ بیچ۔ ڈی نے انگریزی میں ایک مقالہ سنا یا جس کا موضوع ”تعلیم و تہذیب کے متعلق مشرق کے فلسفیانہ خیالات“ تھا۔

اس مقالہ کے ختم ہونے کے بعد تحریریک مندرجہ ذیل پیش ہوئی۔

”اس کانفرنس کی رائے میں اس امر کی ضرورت ہے کہ ملک کی بڑی بڑیوں کی سود مند کی متعلق لے۔ یہ مقالہ انگریزی صحیفہ ملاحظہ فرمایا جائے۔“

دندہ دار اداروں کے توسط سے سائنٹفک طریقوں پر تحقیقات عمل میں لائی جائے۔“
 ڈاکٹر سید حسین صاحب ام۔ یس۔ سی۔ پی۔ پریج ڈی (لندن) پروفیسر کیمیا جامنہ غمانیہ نے جو تقریر
 کی اس کا خلاصہ یہ ہے۔

جناب صدد!

ادویہ نہایت قدیم زمانہ سے ہندوستان میں استعمال ہوتی آئی ہیں۔ چنانچہ رگ وید میں بعض پودوں کا
 ذکر ہے جو دوا کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔ ایور وید میں جو تقریباً ۴ ہزار سال قبل لکھی ہوئی کتاب ہے
 داؤں کے خواص اور استعمال سے آٹھ ایوایب میں بحث کی گئی ہے۔ ہندو اطباء کا علم دیگر ملکوں کے اطباء
 بہت بڑا ہوا تھا۔ یونانی اور رومی۔ ہندی طب کے مین منت تھے۔ چنانچہ دستوریدکس کی پہلی کتاب میں
 کئی ایک ہندوستانی پودوں کا ذکر ہے۔ اور کثیر مقدار میں ادویہ ہندوستان سے روم جاتے تھے۔ مشہور
 ہے کہ بلیناس کو شکایت تھی کہ ہندوستانی ادویہ کے خریدنے میں روم کا سونا ہندوستان چلا جا رہا ہے۔ لیکن
 اس کے بعد ہندوؤں نے تحقیقات کرنا چھوڑ دیا۔ اور ہندو طب کو زوال شروع ہوا۔ اس دور میں بہت سا یورپی علم
 مسخ ہو گیا یا ضائع ہو گیا۔ طب پوجاریوں کے ہاتھ میں گیا اور ادویہ کی جگہ تو بید پلٹتے استعمال ہونے لگے۔

اس کے بعد مسلمان آئے۔ یہ اپنے ساتھ اپنا نظام طب ہندوستان میں لائے۔ یہ نظام اس زمانہ
 کے ہندو طب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا اس لئے اس کا رواج بڑھ گیا۔ گذشتہ ایک ہزار سال کے دوران
 میں دونوں نظاموں پر ایک دوسرے کا اثر پڑا گیا اور دونوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا۔ اس کے
 نتیجہ کے طور پر طب کا بہت بڑا ذخیرہ پیدا ہوا۔

پورچین لوگوں کی آمد نے مغربی نظام کو رواج دیا۔ اور اس کی وجہ سے ہندو اور مسلم دونوں نظاموں کو
 مزید صدمہ پہنچا اور ہندوستانی ادویہ کی بجائے بیشتر یورپ کی بنی ہوئی ادویہ استعمال ہونے لگیں۔ یہ ادویہ
 اتنی گراں میں کہ باوجود حکومت کی فیاضی کے ایک کثیر آبادی کو میسر نہیں آسکتی۔ ان کو ارزاق کر نیکا ایک طریقہ
 ہی ہے کہ پُرانے نظاموں میں جو ادویہ استعمال ہوتی ہیں ان کا اور دیگر ماخذوں کا امتحان کیا جائے ان سے
 حامل جزو الگ کیا جائے اور اس کا اثر حیوانوں اور انسانوں پر معلوم کیا جائے اور پھر بیماریوں میں بہم پہنچایا
 جائے۔ ہمارے جنگلوں میں جڑی بوٹیاں اس کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ اگر ان سے ادویہ تیار کی جائیں تو ہمارے
 ملک کے ہر رشتہ دار کو اس کے لئے کچھ نہ ملے گا۔

محمد فاروق صاحب بی۔ اے۔ پنج یس یس۔ مددگار بلدیہ نے اس تحریک کی تائید میں مختصر تقریر کی اور بنگال کے کارخانہ ادویہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کام کی سودمندگی کی صراحت کی۔

تحریک بالاتفاق منظور ہوئی جس کے بعد ڈاکٹر ذاب ناظر یار جنگ بہادر نے جب ذیل تحریک پیش کی۔
”کافر نس اپنی سابقہ تحریک پر کہ درستی کتب اور سامان تعلیم کی ارزانی کے لئے منجانب سررشتہ تعلیمات خاص تدابیر اختیار کرنے کی شدید ضرورت ہے مگر توجہ مبذول کراتی ہے“

ذاب صاحب نے یہ تحریک پیش کر کے مختصر تقریر کی اور یہ صراحت کی کہ ہر سال یا ہر دوسرے سال نصاب کی کتابیں کس طرح تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور اس کی وجہ سے کیا وقتی پیش آتی ہیں ان دفتروں کو اپنے ذاتی تجربہ سے واضح کیا، کتب نصاب سے بڑھ کر سامان تعلیم کی فراہمی میں جو مشکلات رونما ہونے لگی ہیں ان کی بھی وضاحت کی۔

ذاب میر محمد علی شاہ صاحب نے اس تحریک کی تائید کی اور کہا کہ
جناب صدر مغرز خواتین حضرات!

ذاب ناظر یار جنگ بہادر نے جو کچھ اپنی تحریک میں بیان فرمایا ہے اس سے مجھے پورا اتفاق ہے میں اس تحریک کی تائید کرتے ہوئے چند اپنے ذاتی تجربے بیان کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔
بین پچیس سال قبل جو مدارس میں تعلیم دی جاتی تھی اس وقت کسی شخص پر اس قدر تعلیم کا بار نہیں پڑتا تھا جو اس وقت پڑ رہا ہے جب تک ابتدائی تعلیم ہوتی تھی سلیٹ اور تختی سے لکھنے کا کام لیا جاتا تھا۔ اب غور کرنیکی جائے ہے کہ شکل سے لڑکے کی تعلیم شروع ہوتی ہے کہ اس کے لئے کاپی وہ بھی خاص اسی مدرسہ کی ہونا چاہیے جس پر اس مدرسہ کی تصویر چھپا بیچ چھ آنے سے کم نہیں مل سکتی اس کے ساتھ ہی ساتھ فنن بن بھی ضروری ہے اسی طرح کتابوں کا حال چھ پہلے زمانہ میں ایک کتاب مختلف لڑکوں کے کام آتی تھی۔ مثلاً ایک لڑکے نے جب رتی پائی تو وہ کتابیں اس کے جھوٹے بھائی کے کام آ سکتی تھی مگر اب یہ حال ہے کہ اس ہی لڑکے کے لئے وہ دوسرے سال کام نہیں آ سکتی یعنی خصوصاً حسابی تاریخی کتابیں جن میں صرف زیادہ مضمون پڑھنا پڑتا تھا لیکن کتابیں وہی ہوا کرتی تھیں اب تو یہ حال ہے کہ جہاں درجہ تبدیل ہوا۔ کتابیں بھی تبدیل کر دی گئیں یعنی ایک وقت ایک صاحب کی لکھی ہوئی کتابیں ہی مضمون کی پڑھائی جاتی ہے تو دوسرے درجہ میں اگرچہ وہی مضمون ہے لیکن دوسرے صاحب اس کے لکھے والے ہوتے ہیں۔ کئی اقسام سے تعلیم گراں ہوتی جا رہی ہے جو صاحب

اولاد چھوٹی اولاد کو تسلیم دلانا مشکل ہوتا جا رہا ہے اس لئے میں نواب ناظر یار جنگ بہادر کی تحریک کی تائید کرتے ہوئے گورنمنٹ سے درخواست کرتا ہوں کہ اخراجات تعلیم کی جانب توجہ مبذول کریں۔

مولوی خواجہ محمد احمد صاحب ام ایچ ال ال بی نے اس تحریک سے اس بنا پر اختلاف کیا کہ اسکی وجہ سے کوئی مسئلہ سیار کسی طرح قائم نہ ہو سکیگا اور سستی اشیاء کے بازار میں آنے سے ذوق صحیح متاثر ہو جائیگا۔

مولوی محمد فاروق صاحب بی ایچ بی سی نے مولوی خواجہ محمد احمد صاحب کے خیالات کی تائید کی، مولوی فاضل حامد الدین صاحب فاضل نے اصل تحریک کی تائید کی، محکمہ تحریک نے جواباً اس امر کی توضیح کی کہ اصل تحریک کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مسئلہ سیار اور ذوق صحیح کو پس پشت ڈال دیا جائے بلکہ ملک اور تعلیم پانے والے طبقات کے معاشی حالات کے لحاظ سے اس تحریک کو روکنا چاہئے بعد ازاں اصل تحریک بغلیہ آرا منظور ہوئی۔

اس وقت راجہ بہادر رائے بشیشو زاتہ صاحب کن جوڈیل کمیٹی نے "قانون کی تعلیم کے لئے موجودہ طریقہ تعلیم کس حد تک موزوں ہے" کے عنوان پر جو مقالہ سنایا وہ حسب ذیل ہے۔

مختصرہ صاحب صدقہ و حاضرین جلستہ

آپ کو معلوم ہو گا کہ میں اس مضمون پر سمیع خراشی کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں قانون کی تعلیم کس قسم کی ہونی چاہیے اور مردوجہ طریقہ تعلیم سے اس ضرورت کی کس حد تک تکمیل ہوتی ہے مضمون خشک ہے۔ اس کے علاوہ عدالتی اشخاص سے ادبی تقاریر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ عدالت کے فیصلہ عام فہم ہونا ضروری ہے یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ عبارت سہل ہو اور مضمون جامع الغرض میں ابتدا ہی میں تکلیف دہی کے لئے معافی کا خواستگار ہوتا ہوں۔ کارکنان کا نفرنس کا یہی میں ہونا منت ہوں کہ اس مضمون کو اس کانفرنس کے پروگرام میں جگہ دی گئی ہے۔

مسئلہ کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اختصار کے ساتھ ان خیالات کا خاکہ پیش کیا جائے جو موجودہ زمانہ میں قانونی اور قانونی دنیا کے متعلق عام طور سے پھیلے ہوئے ہیں۔ نہ صرف اس شہر میں اور ہندوستان میں بلکہ ساری جہاں میں یہ مضحکہ اڑایا جاتا ہے کہ قانون اور حقیقی انصاف ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ حکومت فرانسس کی ایک ممتاز ہستی کے نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ جہاں کو دلوں کی اعلیٰ ترین عدالت میں ایک تصویر دکھائی گئی جس میں انصاف اور قانون کا بغلیگر ہونا بتایا گیا تھا۔ ممدوح نے۔

'Before separating, Law and Justice are kissing each other good bye. Perhaps they will never meet again.'

جب ایسی اہلی ہستیوں کے خیالات اس طرح کے ہیں عوام کے خیالات کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی کسی اصطلاحی عذر کی بنا پر کسی کا دعویٰ خارج کر دیا گیا ہو تو بھی شکایت کی گئی کہ حقیقی انصاف نہیں ہوا۔ انگلستان میں تو اس بارے میں کسی زمانہ میں ایسی خورشیں برپا ہوئی کہ بالآخر معمولی عدالتوں کے علاوہ ایک جدید عدالت ایکوٹی قائم کرنی پڑی۔

ہندوستان کی عدالتوں کو بھی احکام قانون کے نفاذ کے ماسوا یہ اختیار بھی عطا کیا گیا کہ اصول عدالت پر عمل کر سکتی ہیں۔ گویا قوانین کے لحاظ سے نزاعات کا فیصلہ کرنا عدل گستری میں داخل نہیں ہے۔ میرا ارشاد اس طرف ہے کہ یہ عام طور سے فہم کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ عدالتیں

Courts of equity and good conscience بھی ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک دوسرے نقطہ نظر کا بھی تذکرہ ضروری ہے۔ یہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ اگر عدالت میں جانا پڑا تو دین و دنیا خراب ہوگی۔ ایک مائیکورٹ کی عمارت پر دو مقدمہ باز کے مجھے بنے ہوئے ہیں یہ دونوں برہنہ ہیں اور صرف ایک ایک لنگوٹی لگائے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں ایک مقدمہ کے فریق تھے جو ایک دوسرے کے مقابلہ میں مدت دراز تک کسی جائداد کے حاصل کرنے کے لئے لڑتے رہے حتیٰ کہ کامیاب اور ناکامیاب ہر دو فریق تباہ و برباد ہوئے ایک کتاب میں اس موضوع پر حسب ذیل خیال ظاہر کیا گیا ہے۔

There is a wide-spread feeling among the general public that law ought to be definite and that its application ought to be swift.

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قوانین کی تعبیر میں بسا اوقات بعض مسائل میں اختلاف ہو جاتا ہے اور قانون دان اسباب کی انتہائی کوشش رہتی ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر کے مطابق فیصلہ حاصل کریں اور

اس طرح اہل غرض کو سلسلہ بہ سلسلہ ایک سے زیادہ عدالت اے انصاف کا دروازہ کھلکھٹانا پڑتا ہے جو موجب زیر باری ہوتا ہے ایک کتاب Law and the Modern mind. میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے

How many law students taught
frankly that un-certainty in the rules as well as
in facts is practically a pre-requisite for litigation.

واقعات کے لحاظ سے بھی نتیجہ نکالنے میں اختلاف آرا، کی گنجائش رہتی ہے۔ بہر حال عوام کا یہ شکوہ بھی بجائے خود غصیدہ صمیم نہیں ہے۔ آرزو یہ رکھی جاتی ہے کہ کوئی نزاع بھی درپیش آئے اس کے متعلق مسعین طریقہ ہر قانون دان ایک ہی رائے قائم کر سکے۔ اور اس طرح اہل غرض صمیم طور سے اندازہ کرنے کے قابل ہو کہ کس حد تک اسے اپنے ادعائیں کامیابی کی توقع ہو سکتی ہے۔ یہ کیفیت پسندیدہ منظر ہے نہیں دیکھی جاتی ہے کہ مساکل قانونی اور واقعات پر مختلف تجاویز کا امکان ہو۔

ایک مزید عام ٹھکانہ کا تذکرہ بھی کر دیا جاتا ہے اگرچہ کہ وہ بلند خیالی پر مبنی نہیں ہے۔ عام طور سے پٹو مارا جاتا ہے کہ قانون پیشہ اشخاص کے فرائض میں یہ داخل ہے کہ جھوٹ اور سچ بول کر کسی طرح بھی اپنی مقصد میں کامیابی حاصل کی جائے۔ ایسے خیالات کی وجہ سے پیشہ وکالت کو کس طرح ذلیل سمجھا جاتا ہے اسکا انداز اس وجہ سے لینگا۔ انگلستان میں پیشہ وکالت کی تعلیم کے لئے Inns قائم ہیں ایک Inn کے احاطہ میں ہی وکلاء کے گاؤں اور ویگ Wig بنایا اور درزی رہتا تھا اسکا ایک بیٹا تھا جو بہت ہوشیار تھا ایک بیرسٹر نے درزی سے سوال کیا تم اپنے بیٹے کو کس پیشہ میں داخل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ درزی نے تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا کہ ”اگر یہ بچہ تین روز میں ہوشیار ثابت ہو تو اس کو وہی پیشہ میں لگاؤں گا۔ اور اسکے برعکس ثابت ہو تو اس کو بیرسٹر بنا دوں گا“ ہندوستان میں بھی عام طور سے یہی خیال سراٹ کیا ہوا ہے کہ اگر کسی گراجویٹ کو سرکاری ملازمت میں داخل ہونے کا موقع نہ ملے یا وہ کسی دوسرے فن کے حاصل کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو قانون کی تسلیم کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جب میں یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر کے نکلا جسکو تقریباً ربع صدی سے زائد عرصہ گزرا ہے اس وقت ہندوستان کی یہی فضا تھی اور اس وقت بھی یونیورسٹی گراجویٹس کو ایسا ہی شہرہ ملتا ہے۔

حاضرین! اس نہید کے بعد جس سے۔ اس فضا کا اندازہ ہو جاتا ہے جس میں قانون اور قانون پیشہ کی

بہت گزائی جدوجہد کے ساتھ اپنے مقام پر قائم ہے۔ اس کیفیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ارباب بصیرت کے لئے اس پر غور کرنے کی ضرورت داعی ہو گئی ہے کہ کس حد تک اور کس طرح علم قانون کی تسلیم و اشاعت کو کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے اس پر رائے قائم کرنی چاہیے کہ آیا واقعی قانون کی تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں۔ ہر تمدن میں اسپر زور دیا گیا ہے کہ حکومت کی جانب سے انصاف رسانی کا انتظام ہونا چاہیو۔ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے طبقے کے وجود کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے جو انصاف حاصل کرنے میں عدالت اور اہل غرض کی امداد کر سکیں۔ اس تاریخی تحقیق پر کسی تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ لفظ ”وکیل“ کا وجود خود اس کی دلیل ہے کہ موجودہ تہذیب کے پیشتر بھی ایسا طبقہ معرض وجود میں تھا۔ منو سمرتی میں لفظ ”یراڈورک“ جا بجا آیا ہے جو موجودہ اصطلاح ایڈوکیٹ کے مترادف ہے۔ ۱۶۱۳ء میں انگلستان کے ایک مقضن سیرن ڈیوس Sir John Davies نے یہ کہا تھا۔

All men at all times and in all places do stand in need of justice and of Law which is the rule of justice and of the interpreters and ministers of the law which give life and motion into justice.

بہر حال عدالت اور وکلاء کی ضرورت ہر زمانہ میں رہی ہے اور رہیگی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان قوی کوششوں کی وجہ سے جو اس وقت تمام دنیا میں عوام کو زیادہ فہیم اور سنجیدہ بنانے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ انگلستان کے میں آجوں کی عدالت عالیہ اور تین ہزار پیشہ وکالت انجام دینے والے بیرونیوں کی ضرورت باقی نہ رہے۔ سرکار عالی میں نوآرکان عدالت عالیہ اور ان کے ماتحت نظام عدالت اور ۲۶۲۹ وکلاء میں تخفیف کی ضرورت پیدا ہو جائے۔ ممکن ہے کہ دستور العمل ارمثال اراضی و دستور العمل مصالحت قرضہ کے مماثل قوانین کے نفاذ سے باہمی تصفیہ کرنے کی صلاحیت عوام میں پیدا ہو جائے اور مفید بازی میں کبی ہو جائے لیکن کسی حالت میں بھی اس کا امکان نہیں ہے کہ رعایا میں نزاعات باہمی پیدا نہ ہوں اور شخص ثالث کے تصفیہ کی احتیاج نہ نہ ہو وکلاء کے وجود کی اہمیت اہل معاملات کے تجربہ سے ثابت ہوئی ہے۔ میرے ایک ذاتی تجربہ کا تذکرہ بے موقع نہ ہو گا بلکہ حیدرآباد میں میرے ابتدائی زمانہ وکالت میں ایک

ناظم عدالت اس طبیعت کے واقع ہوئے تھے کہ وکلاء سے نفرت رکھتے تھے۔ لیکن جلد وکلاء نے ان کے اجلاس پر حاضری ہونے کا تہیہ کر لیا، فاضل حاکم نے تمام دن صرف ایک مقدمہ کے فریقین سے مقدمہ سمجھنے میں صرف کر دیا۔ پس قانونی تعلیم کی تنظیم پر غور کرنے کے سلسلہ میں ان واقعات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ عدالت اور وکیل قانون ساز کو قائم رکھنا اب ضروری ہے۔ غور طلب امر یہ رہتا ہے کہ کس طرح ایسی ہستیوں کو پیدا کیا جائے جو صحیح معنوں میں حصول انصاف میں مفید ثابت ہوں۔ یہ تصور غلط ہے کہ قانون اور انصاف جداگانہ شے ہیں۔ قانون انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے اور انسان ہی اس پر عمل کرتے اور کر سکتے ہیں۔ اگر قانون قدرت کی طرح انسانی ضوابط کے نسبت صحت اور یقین کی توقع کیجاتی ہے تو درحقیقت قانون کی خامی نہیں ہے بلکہ ہماری سمجھ کا پھیر ہے۔ قانون میں دراصل جس موضوع پر کہ وضع کیا گیا ہو متعلقہ سماجی تصورات اور تمدنی کیفیات کا ایک نمایاں اثر رہتا ہے اور دراصل کسی ملک کا قانون اسکی سوسائٹی کے خیالات کی نمائندگی کرتا ہے۔

کسی موضوع پر ایک خاص قانون وضع ہو جائیگا انریہ بھی ہوتا ہے کہ اس طرح سوسائٹی کے خیالات بننے لگتے ہیں۔ پس دراصل انسانی قانون ایک جانب موجودہ انسانی جذبات اور عملیات کا عکس ہوتا ہے اور دوسری جانب بعض امور میں باشندگان ملک کو ایک خاص طریقہ تمدن کی رہنمائی کا کام دیتا ہے زمانہ کی رفتار کے ساتھ ہر قوم کے تمدن میں تبدیلیات واقع ہو جاتی ہیں ان تبدیلیوں کے اثرات کا احساس خود افراد قوم کو ایک دم نہیں ہو کر تا ہے پس جدید ضروریات و احساسات کا مقابلہ کرتے ہوئے عوام کو موجودہ قانون غیر معنی اور ناقص محسوس ہونے لگتا ہے۔ اسی غرض کی تکمیل کیلئے ہر حکومت میں اسکا انتظام رکھا جاتا ہے کہ وقتاً فوقتاً مختلف تمدنی امور کے نسبت نافذہ احکام میں ترمیم و تہتجیح کی جائے۔ انگلستان اور بعض دیگر ممالک میں اکثر امور پر منضبط قوانین نہیں ہیں۔ ہندوستان اور سرکار عالی میں بیشتر احکام وضع شدہ قوانین کے ذریعہ نافذ ہیں اور اگر اول الذکر ممالک میں اس مطابقت کا فریضہ بدوش حکامان عدالت اور طبقہ وکلاء ہے تو ہندوستان اور سرکار عالی کے ایسے ممالک میں اس کی ذمہ داری مجالس وضع قوانین پر عائد ہوتی ہے۔ آخر الذکر ممالک میں کسی طرح بھی عدالت یا وکلاء پر یہ نقطہ صہنی نہیں کیجا سکتی کہ انصاف رسانی قانون اور انصاف کو جدا رکھا گیا ہے اگر کسی زمانہ میں ہمارے تمدن کا اقتضایہ تھا کہ ہر معاملہ میں معاہدہ کی عظمت برقرار رکھی جائے تو یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مہمودہ شرح سود کی ڈگری دینے میں انصاف نہیں ہوا یا وجودیکہ گران

شرح سود کی وجہ سے قرض گیرندہ تباہ و برباد ہو گیا۔ اب تمدن نے اس خاص مسئلہ سود کی حد تک معاہدہ کی قیمت کو قرض گیرندہ کی اقتصادی حالت پر ترجیح دینا قرین مصلحت نہیں قرار دیا ہے۔ مجالس وضع قوانین سے جب مختلف مقامات پر بالخصوص سرکار عالی میں سخت احکام وضع کر دئے گئے ہیں۔ اسی طرح سیماد ساحت کے مسئلہ کے سلسلہ میں یا ایک عدالت کے فیصلوں کے بالاتر محکمہ میں مرافعہ رجوع کرنے کے متعدد حق کے تعلق سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ خاص تمدنی مصالح کو اس ترجیح دیکھ کر حقیقی مطالبہ کے ادائی ہو یا نہ ہو یا آخری تصفیہ سرعت ہو سکے یا نہ ہو سکے حقیقت یہ ہے کہ جس غفلت کے ساتھ بعض دیگر معاشی کیفیات انسانی تمدن کو تبدیل کرنے میں اثر پذیر ہو جاتی ہیں اس تیزی سے مجالس وضع قوانین جدید تصورات کو قانون کی شکل میں لانے میں مقہم نہیں رہا کرتی ہیں اور اسی لئے اس غفلان کا موقع پیدا ہو جاتا ہے کہ قانون اور انصاف میں اتحاد نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہو گا کہ اگرچہ اعتراض بجائے خود صحیح نہیں ہے اسکی ضرورت ہے کہ قانون داں جاہت کے افراد کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پایہ پر ہونی چاہیے کہ ان کی نظروں میں ہوا اور ان میں زمانہ کی رفتار کے سمجھنے کی صلاحیت موجود ہو۔

اس طرح یہ توقعات کہ انفصال مقدمات میں اختلاف آراء نہ ہو اس غلط فہمی پر مبنی ہیں کہ سب انسان عقل و فہم میں مساوی اور ادراک اور قابلیت میں یکساں ہیں۔ البتہ اس احتجاج سے اس ضرورت کا پتہ لگتا ہے کہ اس علم کے یکپارچہ والوں کی استعداد دوسرے علوم و فنون کے حاصل کرنے والوں سے کہیں زیادہ بڑھی چڑھی ہوئی چاہیے دیانت داری اور محنت کی عادت بھی اس تعلیم کا جزو اعظم ہونا چاہیے۔ اگر حکام اور وکلاء دونوں کی قابلیت مسئلہ ہوا اور دونوں دیانت دار اور محنتی ہوں تو عدالتوں میں اختلاف آراء کے خواہ بہ بنا و واقعات یا مسائل قانونی بہت کم مواقع پیدا ہونگے۔ اگر صحیح اور نیک مشورہ ملنے کے باوجود کوئی اہل معاملہ عدالتی چارہ جوئی پر تل جاتا ہے اور اس طرح زیر بار مصارف ہو کر تباہ ہو جاتا ہے اور عمر ضائع کرتا ہے تو یہ تصور اسکی عقل و اخلاق کا ہے نہ کہ قانون اور عدالت کا یہ طعنہ زنی کہ فی زمانہ قانون کی تعلیم اور وکالت کے پیشہ کو بدرجہ مجبوری منتخب کیا جاتا ہے بڑی حد تک بطور واقعہ مبنی بر صحت ہے مگر یہ غلط اتہام ہے کہ قانون دانی انسانیت کو زائل کر دیتی ہے یا بد اخلاقی اور ضمیر فروری کا سبق سکھاتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اکثر متہذہ ممالک کی ترقی اور ارتقاء میں قانون داں اشخاص کا نمایاں حصہ رہا ہے اور بیشتر ان کی رہبری ملک و قوم کے لئے مفید اور کارگر ثابت ہوئی یہ غلط خیال زیادہ تر پیشہ وکالت کے فرائض کی نوعیت کے لحاظ سے پیش کر دیا جاتا ہے اس پر صرف لارڈ میک لین کی ایک تقریر کے چند الفاظ کا حوالہ دینا کافی ہے۔ انہوں نے اسکی تردید کی ہے

کہ وکیل کا فریضہ یہ ہے کہ کسی طرح بھی اپنے فریق کو کامیاب کرادے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

The conception of the advocate as a kind of artful
dodge who made his living by stereotyping his con-
science was utterly remote from the truth.

ایس شہ نہیں کہ تعداد کی کثرت ہو جانے کی وجہ سے یا سیار تعلیم و تربیت بلند نہ ہونے کی وجہ سے ایسے افراد بھی اس طبقہ میں پائے جاتے ہیں اس سے اس کا مزید پتہ چلتا ہے کہ قانون کے موجودہ طریقہ تعلیم میں کسی اصولی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

چونکہ کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ آسانی اخذ کیا جانا چاہیے کہ قانون کی تعلیم کے لئے جو جوان اپنے کو پیش کریں ان میں اصلی علمی استعداد و برتر اخلاق و دیانت داری محنت اور جفاکشی کی عادت کے جوہر بطور شرط مقدم موجود ہوئے چاہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ ایک قانون پیشہ کی کامیابی کا راز خواہ وہ حاکم ہو وکیل ایس ہے کہ وہ محنت کا عادی ہو کفایت شعار ہو ان کی سند درسی اچھی ہو اور اس کا حافظہ قوی ہو۔ اس کے علاوہ ایس یہ مادہ پیدا ہو گیا ہو کہ اپنی رائے پر اعتماد رکھتا ہو۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ زندگی کے کسی دوسرے شعبہ کے لئے ان کمالات کی حاجت نہیں ہے غرض یہ ہے کہ قانون پیشہ اشخاص کے لئے نسبتاً یہ صفات زیادہ ضروری ہیں۔ خواہ پیشہ وکالت انجام دیا جائے یا بحیثیت جج فصل خصوصیات کے اہم فریضہ کی ذمہ داری لے جائے یا نظم و نسق مملکت کے لئے قانون سازی کا فریضہ سپرد کیا گیا ہو وکیل رعایا کی جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کا ذمہ دار ہو تاہنہ جج اور قانون ساز حکومت کے نظم و نسق کا محافظ ہے سرکار عالی میں اس وقت اس جامت کے افراد تیار کرنے کے لئے دو ذرائع سے کام لیا جاتا ہے ایک یہ کہ عدالت عالیہ کے زیر نگرانی تعلیم اور امتحان کا انتظام بشکر ہے کہ اب اس تعلیم کے داخلہ کے لئے بھی میٹرک یا اس کے ماثل امتحان کی کامیابی کی شرط قائم کی گئی ہے۔ دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ مختلف جامعات سے بشمول جامعہ عثمانیہ بی اے یا اسکے ماثل امتحان کی کامیابی کے بعد دو سال قانونی تعلیم دے کر ال ال بی کی ڈگری عطا کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ انگلستان سے بیرسٹری کا امتحان کامیاب شدہ کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے یہ کہا جاتا ہے کہ قدیم و کلا زیادہ کامیاب ثابت ہوئے جے برٹش انڈیا میں ایک مدت تک یہ روایت قائم رہی کہ جامعات کے ڈگری یافتہ و کلا ایسے بیرسٹروں

کو جن کو کسی جامعہ میں تسلیم پانے کا موقع نہیں ملا تھا سبقت لیجاتے رہے روایات اپنی مقام پر اہمیت رکھتے ہیں اور وہ کم از کم ایک حد تک اصلیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو اس تفریق کا راز یہی ہے کہ جبکی علمی قابلیت اور معلومات بہتر تھے اور جو زیادہ مہنتی اور دیانت دار ثابت ہوئے ان کو دوسروں کو مقابلہ میں مقبولیت عام حاصل ہوئی۔ فی زمانہ ابتدائی و ثانوی تعلیم جس جدید طریقے سے دی جاتی ہے یہ بہت غور طلب ہو گیا ہے کہ کس حد تک ایسے حافظہ کی ترقی ممکن ہے اور محنت کی عادت پڑ سکتی ہے۔ اب نہ پہاڑے آزمائے جاتے ہیں اور نہ گرامر کو یاد کرایا جاتا ہے۔ مدرسوں میں انفسرادی طور سے طالب علموں کی نگرانی نامکن ہو گئی ہے اور گھر پر خانگی تعلیم کے انتظام کو ناپسندیدہ قرار دیا جاتا ہے یہ کوشش بھی جاری ہے کہ ایل ایل بی کی تعلیم کے لئے کالج کی پوری تعلیم بھی ضروری نہیں ہے۔ اگرچہ موجودہ کالجوں کی تعلیم کو اطمینان بخش نہیں کہلایا گیا بریں ہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اعلیٰ مضامین کی کتب کے مطالعہ سے کالج کے طلبہ کی ذہنیت اور اخلاقیات پر ایک خاص اثر مرتب ہوتا رہا ہے یہ بہت غور طلب ہے کہ آیا اعلیٰ تعلیم کا موقع نہ دینے کے نتیجہ قانونی تعلیم سے اخلاق اور قابلیت کے اس بلند معیار کو دھکے تو نہ لگیگا جسکی ضرورت کی طرف اس تقریر میں اشارہ کیا گیا ہے۔ میں مدبر نہیں ہوں اور نہ تعلیمی مسائل کا ماہر البتہ زمانہ کے حالات کا مطالعہ میں بھی کیا کرتا ہوں اور صاحب اولاد ہونے کی وجہ سے ان امور پر فطرتاً غور کرتا رہتا ہوں اس لئے چند منظر اور ناقص خیالات کو پیش کرنے کی جرات کی گئی۔ ارباب مقتدر اگر ملک کی بہبودی اور نظم و نسق مملکت کی اصلاح کے لئے ان مسائل کو قابل توجہ تصور فرمائیں تو مشکلات حل ہو سکتے ہیں۔ بہر حال آپ کا زیادہ وقت نہ لیتے وقت آپکی غور و فکر کے لئے ان مسائل کو پیش کر کے میں اپنی جگہ لینا ہوں۔

اس مقالہ کے اختتام پر نواب مرزا یار جنگ بہادر صدر المہام عدالت و امور مذہبی سرکار عالی نے ”ترک مسکرات“ کے موضوع پر ایک تفسیر فرمائی جسکا حاصل ذیل میں نقل کیا گیا ہے۔

جسناصلہ!

ہوشمندوں کے لئے تاریخ کے مطالعہ میں یہ بات بہت مرغوب ہو ا کرتی ہے کہ دور حاضر کو ماضی کی روشنی میں دیکھیں یا اس بات کا اندازہ لگائیں کہ چند گزشتہ نے زمانہ حال پر کس کس طرح اثر ڈالا ہے۔ ترک مسکرات کی تحریک جو آج ہندوستان کے طول و عرض میں آندھی کی طرح اٹھی ہے عالم معاشرت میں ایسا تلاطم پیدا کرے گی کہ نہ صرف ہمارے وطن بلکہ کچھ عجیب نہیں کہ تمام نفع بشر کی زندگی کا رنج بدل دینے میں ایک نمایاں ذریعہ

ثابت ہو۔ میں اس وقت یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس تحریک کا آغاز کیونکر ہوا۔ میں ایک لندن دوست مسٹر فریڈرک گٹ کا نہایت ممنون ہوں کہ واقعات بہم پہنچانے میں مجھ کو ان سے بہت مدد ملی۔ تحریک حاضرہ کے محرکات کو سمجھنے کے لئے ہمیں کوئی ڈیرہ سو سال پیچھے جانا ہو گا جب کہ سن ۱۷۹۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ فیصلہ کیا کہ آبکاری کو محاصل کی ایک مستقل مدد بنا دیا جائے اور اس عہدہ سے اپنے اولین ضوابط آبکاری نافذ کئے۔ اس وقت سے یہ خواہش بڑھتی گئی کہ اس مدد کی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہے اور ایسے ہر اضافہ کے معنی یہ تھے کہ شراب خواری میں ترقی ہو اور ایسی ہر ترقی کا لا بد نتیجہ یہ تھا کہ اسی نسبت سے شراب خواروں کی اخلاقی حالت میں زوال آتا گیا قریب قریب نوے برس تک یہی صورت قائم رہی اور حالات بد سے بدتر ہو گئے یہاں تک کہ اہل ہند کو منافہ نظر آنے لگا کہ حکومت کا یہ طریق عمل مادر وطن کو کس درجہ جسمانی و روحانی زبوں حالی کی جانب لئے جا رہا ہے۔ اس وقت کینٹ چنر دسین جیسی طبیعت کے لوگ میدان میں آ گئے اور اس طریق عمل کے خلاف جنگ پر تیار ہو گئے ہندوستان کی حکومت اور اصلاح معاشرت کے داعیوں کے درمیان واقعی مقابلہ گزشتہ صدی کے عشرہ مہتمم کے ابتدائی سنیں میں شروع ہوا۔ ہندوستان کے لئے شراب خواری محض اخلاق و معاشرت کی خرابی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ سچ پوچھئے تو یہاں یہ مسئلہ تھا کہ کیا یہ بات ان کے مذہب کے خلاف کی جا رہی ہے چنانچہ یہاں والوں نے تحریک ترک سکرات کو ایک مذہبی مسئلہ سمجھ کر اس کا ساتھ دیا اور اس تحریک کی پشت پر جو اخلاقی قوتیں کام کر رہی تھیں بالآخر انہیں حکومت کو مجبور کیا کہ سن ۱۸۳۲ء میں اس مسئلہ کی تحقیقات کیلئے ایک کمیشن مقرر کیا جائے حق کامیاب ہو کر رہا اور کمیشن نے بھی حکومت کے خلاف فیصلہ صادر کیا یعنی شراب خواری کی بدولت جسمانی نفعائیں اور اخلاقی انحطاط کی جو مصیبت قوم پر نازل ہوئی تھی اس کا ذمہ دار حکومت کے اصول آبکاری کو قرار دیا۔ اس فیصلہ سے اہل انگلستان کے دل ہل گئے اور ان کا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ مسٹر کین اور سیم یول اسمتھ جیسے مزاج اور مرتبہ کے لوگ ہندوستان کی حالت پر کمر بستہ ہو گئے۔ یہ دونوں صاحب پارلیمنٹ کے رکن تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ہوز آف کامنس یعنی دارالعوام نے ۱۸۳۳ء کے مقابلہ میں ۱۱۳ آراء سے حکومت ہند کے آبکاری کے مسلک کو قابل الزام ٹھہرایا۔ پھر تو یہ رنگ دیکھ کر حکومت ہند کو بھی اپنی روش بدلتی پڑی۔ سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ آئندہ سے حکومت کا مسلک یہ رہے گا کہ شراب کا استعمال گھٹانے اور محصول بڑھانے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن یہ نیا اصول عمل بھی مفید ثابت نہ ہوا اور ملک کی اخلاقی انحطاط کا سدباب کرنے میں کچھ کام نہ آیا۔ جب عہدہ دار ان آبکاری کی قدر افزائی تو فرما لیا ہی

پرنسپل ٹھہری تو وہ اپنے آپ کو انسانی معمولی کمزوریوں سے بالاتر نہ کر سکے اور اپنی کارگزاری دکھانے کے لئے ایسی ایسی تدبیروں پر اتر آئے کہ محاصل آبکاری میں پیچیدہ اضافہ ہی ہوتا چلا گیا رقوم محاصل کے نقشہ میں وہ خواجہ محصول آبکاری دکھاتا تھا برابر بلند تر ہوتا رہا اور اسکی ترقی میں کوئی منسوق نہ آنے پایا حتیٰ کہ یہ رقم مسئلہ میں اگر تین کروڑ تھی ہو مسئلہ میں بڑھتے بڑھتے گئی یعنی نو (۹) کروڑ اور مسئلہ میں شش ٹھہری یعنی شش کروڑ روپیہ ہو گئی۔ حالت اضطراب میں لوگوں نے کئی بار وزیر اعلیٰ ہند کی خدمت میں با اثر و فودر وادہ کئے مگر ان کی فریاد صد الصحرانابت ہوئی پھر داران مال اور ان کے ماتحتوں کی آنکھیں کسی طرح نہ کھلیں۔ مسئلہ میں مجلس وضع قوانین ہند نے حکومت کے اصول آبکاری کے خلاف ایک تحریک منظور کی اور اس طریقہ سے اہل ہند کی سخت ناراضی کا پھر اظہار کیا لیکن حکومت نے رائے عامہ کے اس مظاہرہ کا پھر بھی کچھ لحاظ نہ کیا۔ تعلیمات ایسے ملکوں کے مصارف کو داخل آبکاری سے وابستہ کر کے سب سے قوی حجت یہ پیش کی کہ تعلیم عامہ کے اخراجات کو کم کرنا ممکن نہیں ہے۔ حامیان اصلاح نے جواب میں یہ کہا کہ ایسی تعلیم ہی کس کام کی جس پر اخلاقی خرابی کا دھبہ ہو۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر ذریعہ محاصل ہی غلط ٹھہرا تو پھر اس کے قائم رکھنے کا اصرار بھی غلط ہوگا۔ انہوں نے حکومت کے ایسے اصول و مسلک کی سخت مخالفت کی جس کے تحت خود حکومت شراب ساز و شراب فروش بن گئی اور اپنا فائدہ اسی میں دیکھنے لگی کہ اس کا رد و بار کو منسوخ ہو۔ حکومت کی یہ خواہش عایا کے حقیقی مفاد کے صریحاً خلاف تھی حالانکہ حکومت تو رعایا کی نگہبان و ولی ہوا کرتی ہے اور اسکا اعلیٰ منصب یہ ہوا کرتا ہے کہ رعایا کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہے لوگوں کو یہ کہنا تھا کہ حکومت کا مسلک رعایا کے مفاد کے مطابق ہونا چاہیئے۔ لہذا اس کا منسوخ ہے کہ ملک میں کسی کو شراب سازی اور شراب فروش بننے سے روکنا ہو تو شراب کی دوکان لگائے جو ہرگز اس کے لئے زیادہ تھا۔ پھر حکومت نے یہ عذر پیش کیا کہ مے نوشی سے روکنا لوگوں کی شخصی آزادی میں مداخلت ہوگی۔ حامیان اصلاح نے اس کا جواب یہ دیا کہ کسی شخص کو ایسی آزادی کا حق نہیں دیا جاسکتا جس سے قومی مفاد میں خلل واقع ہو۔ جلد انسانی قوانین شخصی آزادی کی تحدید کرتے ہیں۔ "قانون شاد دا" اور قانون ازدواج وغیرہ اس قاعدے کی تمثیلات ہیں۔ مگر ان دلیلوں کا بھی حکومت پر کچھ اثر نہ ہوا اور اصرار میں لوگوں کے صبر و تحمل کا پیمانہ جھلک پڑا اور آخر کار مسٹر گاندھی اور مدراس کے موجود وزیر اعظم سٹرلنگ کو بال چاری جیسے لوگ حکومت کے مقابلہ میں اتر آئے اسی زمانہ میں ہندوستان کے لئے جدید دستور وضع کرنے کا سوال پیدا ہوا۔ اس موقع پر تمام سیاسی جماعتیں

نے ۱۹۳۸ء میں مل کر جو میثاق مرتب کیا اس میں بھی امتناع سکرات کو قومی دستور کی ایک بنیادی شرط کے طور پر پیش کیا گیا۔ ترک سکرات کی تحریک اس نوبت پر تھی جب کہ انگلستان نے ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کے صوبوں کو حکومت خود اختیاری دینے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۳۷ء میں اہل ہند نے اسے قبول کر لیا۔ جو لوگ کانگریس کی طرف سے بوقت انتخاب امیدوار ہوئے تھے انہوں نے کانگریس ہی کے نظام عمل کو پیش کر کے اپنا انتخاب جابجا کی اہم دفعات میں امتناع سکرات بھی شامل تھا۔ کانگریسی وزارتوں کی اولیں ساعی کا اظہار اس طرح ہوا کہ امتناعی قوانین سکرات نافذ ہونے لگے اور اب غیر کانگریسی وزارتیں بھی اس باب میں جذبات عامہ کے خلاف چلنے کی جرات نہیں کر سکتیں چنانچہ وہ امتناع سکرات کی تائید میں کانگریس پر بھی سخت یوجانے میں کوشاں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم میں بعض حضرات کو ان قوانین کی کامیابی میں شبہ ہے۔ لیکن انہیں چاہیئے کہ چند ضروری حقائق کو ذہن نشین فرمائیں۔ کسی قوم کے قوانین کا رنگ روپ اس کے افراد کی خلقت و افتاد مزاج ہی کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ جذبات عامہ کسی قانون کی پشت پر ہوتے ہیں اسی قدر یہ قانون بانزو و کارگر ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے ممتاز مذاہب شراب نوشی کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اور مزاجا کسی ملک کی فطرت میں مذہب اس درجہ رچا ہوا نہیں ہے جس قدر ہندوستان میں۔ یہاں کے پکے شراب نوش بھی اگر مذہب و ملت کی عدالت میں طلب کئے جائیں تو اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہیں اور کبھی اس عادت بد کی کوئی صفائی نہیں پیش کرتے جس چیز کو یورپ نے آج سیکھا ہے اور جس کی تلقین آج ان (۶۰) ملکوں میں کی جا رہی ہے جو مجلس قوام کے ارکان ہیں اس کا سبق ہندوستان کے بزرگوں نے ہزاروں سال پہلے اوپنیمیر عربی (علیہ السلام) سے سیکھا تھا۔ تیرہ سو برس قبل دنیا کو دیا تھا۔ ہندو دین میں بدھن شرابی کے لئے سزائے موت تک دی جاتی تھی۔ دین اسلام شرانجوار مسلمان کو خدا کے حضور میں آنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اس کا رفیق شیطان اور اس کا ٹھکانا دوزخ بتاتا ہے۔ غرض پرہیزگاری کا عقیدہ اہل ہند کے دگ و پے میں پوسٹ ہے اور یہی وہ حقائق ہیں جن کی تہہ زمین پر ہندوستان کے اہل تدبیر ترک سکرات کا نقشہ تیار کر رہے ہیں۔ اسی لئے واثق امید ہوتی ہے کہ وہ خم جو امریکہ کی مٹی میں جڑ نہ پڑ سکا۔ ہندوستان کی سر زمین میں جھے گا اور خدا نے چاہا تو خوب پھولے پھلے گا۔ کیا عجب ہے کہ ترک سکرات کا علم ہندوستان کے ماتھے میں ہو۔ اور وہی اس مقدمہ میں تمام عالم کی رہنمائی کرے خصوصاً اس وقت جبکہ اہل دنیا کو صاف نظر آ جائے جیسا کہ اب نظر آنے لگا ہے کہ بلائے سنواری نوع انسان پر کیا کیا آفتیں ڈھا رہی ہے۔

اس بلا سے صرف مالک محروسہ حیدر آباد کے باشندوں کو ہر سال قریب قریب دس کروڑ روپیہ کا

اقتصادی و مالی نقصان اٹھاتا ہے۔ یہاں کی کل آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے لہذا اربو متناسبہ کے سادہ قاعدہ سے حساب لگائے تو یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ ہندوستان کی جملہ تنقیش کروڑ آبادی میں جس کا حال حیدر آباد سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے تخمیناً ۲-۱۰ ارب تنقیش کروڑ روپیہ سالانہ اسی عادت بد کی نذر ہو جاتے ہیں۔

یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ترک مسکرات ملک کی دولت کو باہر نہیں جانے دیتی بلکہ اسے محفوظ کرتی اور ترقی دیتی ہے برخلاف اس کے مسکرات کی عادت اسے خراب و ضائع کرتی ہے۔ ہماری آبکاری اور محصول درآمد شراب کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ اسی لاکھ روپیہ ہوتی ہے شراب فروش علاوہ اس محاصل کے اصل قیمت اور دوسرے متعلقہ مصارف بھی لامحالہ اپنے خریداروں اور گاہکوں سے وصول کرتے ہیں اسکے ماسوا خود ان کا نفع لازماً گاہکوں ہی کی جیب سے آتا ہے۔ ان جملہ امور کو پیش نظر رکھتے تو میں سمجھتا ہوں میرا یہ کہنا کسی طرح بعید از صواب نہ ہوگا۔ شراب کم و بیش (۵) کروڑ روپیہ ہر سال ممالک محروسہ کے شراب خواروں سے وصول کرتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے ہم وطن اتنی کثیر دولت سال بسال اس حرام بانی میں ڈبو دیتے ہیں یہ خالص اسراف زر ہے کیونکہ اس سے نہ کوئی جسمانی نفع حاصل ہوتا ہے نہ روحانی یہ معاشی نقصان کا پہلا عنوان ہوا۔ ثانیاً وقت کا ہر لمحہ مادی قیمت رکھتا ہے۔ لہذا تنصیح اوقات کو بھی مذکورہ بالا اسراف میں شامل کیجئے ریاست کی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ کے قریب ہے اور وہ شراب خوار ہی پر پانچ کروڑ روپیہ خرچ کرتے ہیں تو ہمارا یہ اندازہ لگانا کچھ بجا نہ ہوگا کہ زیادہ نہیں تو پانچ فیصدی آبادی یعنی (۷) لاکھ نفوس ضرور اس عادت بد کا شکار ہیں اب اگر حالت مسکرات اور بعد کے اثرات کو ملائے تو ایک معمولی شراب خوار روزانہ قریب قریب دو گھنٹے کام کرنے کی قابلیت کھو بیٹھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سال بھر میں اس کے تخمیناً ۳۰ گھنٹے کی کمائی کی قوت ضائع ہو جاتی ہے اور اگر (۷) لاکھ آدمی اسی طرح اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں تو مجموعی طور پر ہماری ریاست بلائے شراب کی بدولت ہر سال (۱)..... (۵) کروڑ گھنٹے کے کام اور ان کی کمائی کے فوائد سے محروم ہو جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ ممالک محروسہ کے تلنگانہ کے علاقہ میں شمل سے کوئی شخص ایسا ملے گا جسے دن میں ایک بار مخمر تاڑی یا سینڈ می پینے کی عادت نہ ہو اگر فی کس فی گھنٹہ کمائی کی اوسط قیمت صرف ایک آنہ بھی قرار دی جائے تو ضرب کے معمولی قاعدہ سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ اس میں ممالک محروسہ کا سالانہ مالی نقصان کسی طرح تین کروڑ روپیہ سے کم نہیں ہے۔ اسے سنواری کے نقصان کی دوسری مدد قرار دینا چاہیے۔

پھر قومی ثروت کا بڑا ماخذ افراد قوم کی صحت و توانائی ہے جنگ عظیم کے زمانہ میں اہل انگلستان کو معلوم

ہوا کہ وہاں کے دن فیصدی جو ان جنگ میں حصہ لینے کی قابلیت نہیں رکھتے کیونکہ شراب نوشی کی عادتوں نے ان کی اعصابی صحت غارت کر ڈالی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں اس مسئلہ کی تحقیقات کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر ہوا اور اس نے جو طبی شہادتیں قلمبند کیں ان سے اندازہ ہوا کہ شراب خواری سے دل و دماغ گردہ و جگر اور ان غدود میں جن پرنس پیدا کر نیکا دار و مدار ہے۔ جو طرح طرح کے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے انسانی توانائی اور جسمانی قابلیت کا کتنا بے قیاس نقصان قوم کو اٹھانا پڑتا ہے۔ جسے دیکھ کر آدمی کا دل دل جلے مزید براں ان جرائم کا تصور کیجئے جو اس بلائے بد سے تلازم رکھتے ہیں۔ ۱۸ سال سے زیادہ ریاست حیدرآباد کی عدالت عالیہ کا میٹریس رہا ہوں اور اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر یوں قوی بیان کر سکتا ہوں کہ اس ریاست میں قتل کی وارداتیں بہ تعداد کثیر کسی نہ کسی شراب یا مسکر کے نشہ میں سرزد ہوتی ہیں۔ شہد کی حالت میں قیمتی انبیاء کو توڑ پھوڑ دینا غیر ضروری چیزوں میں روپیہ لٹانا شریعوں کا کبھی کبھی بیوی اور بچوں پر تعدی کرنا جس سے گھر کی زندگی ایک مصیبت بن جاتی ہے پھر شراب خواری کے سلسلہ میں جو جرائم ہوتے ہیں ان کی دریافت، تحقیق، تفتیش اور عدالتی کارروائیوں میں سرکار کے گراں اخراجات یہ سب آفتیں اسی شراب خانہ خراب کے شاخسانے ہیں۔ ایمن و بھنگ وغیرہ منیات بھی مخلوق کو نقصان پہنچانے میں حصہ دار ہیں۔ اب اگر ان اسباب سے جو امراض پیدا کرتے اور قابلیت کار کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مالی خسارے کا تخمینہ دو کروڑ روپیہ سالانہ کیا جائے تو کیا اس میں کوئی مبالغہ ہو گا۔ پھر ان تینوں بات کو ملائے تو ریاست کے مجموعی مالی نقصان کا اندازہ کم و بیش دس کروڑ روپیہ سالانہ ہو گا۔

مسٹر بھروچہ کو سہ کار دعائی نے مقرر فرمایا تھا کہ ریاست کے مزارعین کے قرضوں کی تحقیقات کریں۔ ان کی قابل قدر رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف زراعت پیشہ آبادی ۶۰ کروڑ کے قرض کی زیر بار ہے اور میں باور کرتا ہوں کہ اگر تمام آبادی کو دیا جائے تو تعجب نہیں کہ ممالک محروسہ کے باشندوں پر قرضہ کی کل مقدار ایک ارب روپیہ ثابت ہو۔ یہی آبادی تو اتنے کثیر قرضہ کے بوجھ میں دبی ہوئی ہے ہر سال اپنا دس کروڑ روپیہ منیات میں برباد کرتی اور جسمانی و روحانی طور پر اپنے آپ کو اور مضمحل بناتی اور معاشی اعتبار سے کمائی کی قابلیت کو کم کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ ایسی افسوس ناک حالت ہے کہ کوئی حکومت جسکا مدار ہی رعایا کے کسوت اور وسائل تو بخیر پر ہو اسے دیکھ کر مطمئن اور ماتہ پر ماتہ دھڑبھٹتی نہیں رہ سکتی۔ بخلاف اس کے اگر ترک مسکرات سے لوگوں کو دس کروڑ روپیہ کی سالانہ بچت ہو اور اسی نسبت سے ممالک محروسہ کی دولت میں اضافہ ہوتا رہے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ رعایا میں بھی مناسب اداائی محاصل کی قابلیت بڑھ جائیگی اور محصول آبکاری کی کمی سے

داخل سرکار میں جو خسارہ واقع ہو گا مذکورہ بالا اضافہ سے ہر وقت اس کی تلافی کیا سکے گی۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جس پر ارباب تدبیر و اقدار کی نظر رہنی چاہیے۔ اگر نری صوبوں کی حکومت خود اختیاری قائم رہی تو وہ دن دور نہیں ہے جب کہ نہ صرف ہندوستان اور غیر ممالک بلکہ خود ہندوستان کے مختلف صوبوں اور ریاستوں کے مابین روپیہ پیدا کرنے میں معاشی مقابلہ چڑ جائے گا۔ اگر ممالک عمر و حیدر آباد میں پانچ باقی اور شکر تیار کجاتی ہے تو صوبہ مدراس کو شش کرے گا کہ ان مصنوعات کو زیادہ ستا تیار کرے جب یہ صورت واقع ہوگی تو نئے آنود حیدر آباد کی آبادی پاک لب مدراس کی آبادی سے محنت و توانائی میں کسی طرح بازی نہ لیا سکیگی ہم نے ترک مسکرات کی ابھی صرف بنیاد رکھی ہے اور کوشش کر رہے ہیں کہ لوگوں کے دلوں کو ادھر متوجہ کریں اور ان کی دہنیت بدلیں جاری تیلج مدراس دیہات تک پہنچ گئی ہے۔ یہ سب کام ابھی تک دوستانہ نصیحت اور ترغیب کے اصول پر ہو رہا ہے اور ہم نے کسی جبر کا سہارا نہیں لیا ہے کہ شاید ہماری ترک مسکرات کی عمارت انقلاب خیالات کی مضبوط تر بنیادوں پر قائم ہو جائے بہر حال ہم ایک زیادہ خوشحال اور گرامی حیدر آباد بنانے کا دوستہ تیار کر رہے ہیں۔ ہمارے فرمانروا، حضرت حضور نظام خدائے ملکہ کی شان و سعادت ہمارے ساتھ ہے۔ بندگائے تعالیٰ مظلوم نے مجھے حیدر آباد مرکزی مجلس ترک مسکرات کی بحیثیت صدر شین خدمت گزار کا شرف عطا فرمایا ہے، اور اپنے فرمان و اجل لاؤ عان میں اس نشانہ ہایونی کو صاف ظاہر فرما دیا ہے کہ حضور پر نور اپنی رعایا کو بلائے شراب سے آزاد دیکھنا پسند فرماتے ہیں۔ اپنے بادشاہ ظل اللہ کے احکام عالیہ کی تعمیل میں مجلس ترک مسکرات کے ساتھ اشتراک عمل کرنا عہدہ دار و غیرہ عہدہ دار جلد باشندگان حیدر آباد کا فریضہ ہے۔ ہمارا مقصد پاک و محترم ہے خدا تعالیٰ ہماری مدد فرمائے گا۔

نواب مرزا یار جنگ بہادر کی تقریر کی ختم ہونے پر تحریک ذیل پیش ہوئی :-

”اس کانفرنس کی رائے میں یہ مناسب ہے کہ مدراس میں خواہ وہ

لڑکوں کسموں یا لڑکیوں کے اس عمل کو رواج دیا جائے کہ بڑا نہ

تعلیم طلبہ و طالبات کپڑوں اور دیگر ضروریات زندگی میں کفالت

اور سادگی کو اپنی زندگی کا دستور بنائیں اور مدرسین کو یہ ہدایت دے

جائیں کہ وہ خود اپنے ذاتی عمل کو نمونہ بنائیں“

یہ تحریک ایم نرسنگ راؤ صاحب ایڈیٹر دھیت سنبھیش کی اور سادگی اور کفالت کے فوائد مختصر بیان

کے اور اٹھ حضرت بندگانِ عالی مظلہ العالی کے عاداتِ مرضیہ کو بطور مثال بیان کیا اور یہ مراحت کی کحضرت بنی
عالمی سادگی اور غیر ضروری تکلفات سے احتراز ملک کے لئے رحمت کا باعث ہے۔

مولوی یحیٰی عبدالقادر صاحب شفا نے اس تحریک کی تائید کی اور مختصر تقریر میں بیان کیا کہ :-

جناب صدر !

میرے فاضل دوست نے جو تحریک پیش کی ہے میں اس کی تائید کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ اس
تحریک کے دو پہلو ہیں ایک سررشتہ تعلیمات و دوسرا خود اساتذہ ، اس وقت تک طلباء کے لئے کوئی مقر ولباس
کی مدارس میں پابندی نہیں ہے لیکن حقیقت میں ایکسانیت لباس کی ضرورت ہے تاکہ بڑے چھوٹے مادی
والی۔ امیر و غریب۔ ایک دوسرے پر فوقیت پیدا نہ ہو۔ کیونکہ صرف لباس سے ایک دوسرے میں فوقیت
پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ یہ طلبہ تعلیمی کی ابتدائے نشوونما کا زمانہ ہوتا ہے۔

البتہ طالبات کے لئے بعض فوقانیہ و وسطانیہ مدارس میں ایک ہی قسم کے لباس پہننے کی تاکید کی جا
ہے مگر افسوس اس کا ہے کہ ملل کا کرتہ اور طلس کا بانجامہ اسی کی ایک حد درجہ لیکن ملل کا کرتا بارش سر ہر موسم
کے استعمال کے لائق نہیں ہوتا۔ اور موسم گرما میں بہت جلد پسینہ سے خراب ہوتا ہے۔ دوسرا جاپانی طلس
نہایت خراب ہوتا ہے پہلے ہی دھوپ میں رنگ کی تبدیلی اور پھر یا۔ اور وار کا ہوتا ہے موجودہ کساد بازاری کے
لحاظ سے بہت گراں اور خراب بہت جلد ہوتا ہے۔ بجائے طلس کے دبیز۔ الایچج سرج درہ کے مقابلہ میں
کام میں لایا جائے تو بہتر ہو گا۔ بحیثیت پائیداری اور ارزانی طالبات کے لئے باری ہو گا۔

اساتذہ سے میری گزارش ہے کہ وہ بھی اوسط درجہ کا لباس خود استعمال کریں تاکہ چھوٹے اور بچے
بجائے نو بہانوں کے دلوں میں اعلیٰ لباس کا تخیل پیدا نہ ہو لباس سے بدن کی حفاظت بلحاظ ہر موسم ہے تازی
ہوا۔ سادی غذا۔ اور سحر لباس۔ یہ ایک عام مقولہ ہے جو ہر لحاظ سے مناسب ہے میں اس تحریک کی نہایت
خوشی کے ساتھ تائید کرتا ہوں۔

اس تحریک کی منظوری پر اجلاس سوئم ختم ہوا۔

اجلاس چہارم

جمعہ ۱۳ مہر کو ۲ بجے چوتھا اجلاس آغاز ہوا اور محمد عبدالرؤف صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ وکیل ہائیکورٹ نے تحریک مندرجہ ذیل پیش کی۔

”اس کانفرنس کی رائے میں مدارس نسواں کے طالبات کے لئے ساریوں کا موجودہ انتظام نہ صرف باقی رکھنا ضروری ہے بلکہ اس میں مزید وسعت دی جانی چاہئے۔“
اس تحریک کو پیش کرنے ہوئے مقرر نے کہا کہ

محترم صدر خواتین حضرات!

میں تحریک نمبر (۹) آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ ”اس کانفرنس کی رائے میں مدارس نسواں کے طالبات کے لئے ساریوں کا موجودہ انتظام نہ صرف باقی رکھنا ضروری ہے بلکہ اس میں مزید وسعت دی جانی چاہئے۔“
جب میں نے پہلی مرتبہ معلوم کیا کہ لڑکیوں کے لئے موجودہ ساریوں میں بھی کمی کجانی والی ہے تو میں غور کرنے لگا کہ آخر اسے کیا اسباب ہیں۔ باری حکومت تعلیمی معاملات میں نہایت دربادلی سے رویہ صرف کرتی ہے جس کو دیکھ دیکھ کر باہر کے ماہران تعلیم کے منہ میں پانی آتا ہے، لیکن جب ۲۶ شہر پور کو معلومات عامہ سرکاری کی جانب سے اخبار رپورٹوں میں تو صحیح شائع ہوئی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

میں رپورٹوں میں ۲۶ شہر پور سے ۳۲ لکھ سے ایک سرکاری بیان سنا ہوں جو سرشتہ معلومات عامہ سے شائع ہوا ہے۔

”نسوانی تعلیم۔ مزید سہولتوں کی ضرورت“ سرشتہ معلومات عامہ سرکاری سے حسب ذیل توضیح بغرض اشاعت وصول ہوئی ہے۔

جناب نے اپنے اخبار مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء میں بعنوان ”نسوانی تعلیم۔ مزید سہولتوں کی ضرورت“ جو

مقالہ افتتاحیہ شائع فرمایا ہے اس کے دوسرے جزو کے سلسلہ میں یہ دریافت معلوم ہوا ہے کہ اذروئے ضابطہ مدارس نسواں میں ہر (۲۰) پردہ نشین طالبہ کے لئے ایک شکرمہ یا کجانی ہے۔ چونکہ آئے دن مدارس نسواں میں طالبہ کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اس لئے موجودہ شکرا میں اس بڑھتی ہوئی تعداد کیلئے کافی نہیں ہو رہی تھیں اور اضافہ شکرمہ کے لئے بھی گنجائش کا فراہم ہونا دشوار تھا۔ لہذا سررشتہ تعلیمات نے تحت ضابطہ مجبوراً مدارس نسواں کو ہدایات دیں کہ ہر مدرسہ میں صرف پردہ کرنے والی لڑکیوں کے لئے شکرمہ روانہ کیا جائے اور آٹھ سال سے کم عمر لڑکیوں کے پاس جواب تک شکرموں میں آتی تھیں اور وہ قابل پردہ بھی نہیں ہیں شکرمہ میں نہ روانہ کی جائیں۔

چونکہ روز بروز طبقہ اناث میں تعلیم کا شوق بڑھ رہا ہے اور طالبہ کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے لہذا مدارس کی طالبہ کے لئے سواریوں کی فراہمی کا مسئلہ مشکل تر ہو گیا ہے۔ نیز سابق میں طالبہ تعداد کم ہو چکی وجہ سے جو سواریاں مدارس کیلئے منظور ہوتی تھیں اس میں چھوٹی غیر پردہ نشین اور بڑی پردہ نشین لڑکیاں سب مدارس میں آسکتی تھیں۔ اب جبکہ تعلیمی شوق بڑھ گیا ہے اور پردہ نشین طالبہ کے داخلہ کی درخواستیں کثرت سے آنے لگی ہیں اور بوجہ عدم گنجائش مزید شکرموں کی منظوری کی توقع نہ رہی تو سررشتہ کو لازماً ایسے احکام دینے پڑے کہ جس سے پردہ نشین طالبہ کی آمد و رفت کا انتظام ہو سکے اور وہ تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ احکام بھی دئے گئے ہیں کہ ایسی ٹھہر سال کم عمر لڑکیوں کے لئے جو پردہ نہیں کرتی ہیں لیکن ان کے مکانات مدرسہ سے تین فرلانگ سے زائد فاصلہ پر ہیں ان کیلئے شکرمہ میں نہ روانہ کی جائیں۔

طالبہ کے لئے سواریوں کی فراہمی کے مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے سررشتہ مذکور نے ایک کمیٹی مقرر کی ہے تاکہ بعد غور کا حل وہ ایسی تدابیر پیش کرے جن سے یہ مسئلہ اس طرح حل ہو جائے کہ ایک طرف والدین کی سہولت کا باعث ہو اور دوسری طرف سرکار پر بھی اخراجات کا غیر معمولی بار نہ پڑے۔ مدارس نسواں میں ریلوے بس جاری کرنے کا مسئلہ بھی زیر غور ہے جس کے بعد یقین ہے کہ سواری کی موجودہ شکایت بڑی حد تک رفع ہو جائیگی۔

اس بیان میں سواریوں میں کمی کرنے کا اصلی سبب یہ بتایا گیا ہے کہ لڑکیوں میں اب تعلیمی شوق بڑھ گیا ہے اور پردہ نشین طالبہ کے داخلہ کی درخواستیں کثرت سے آنے لگی ہیں اور بوجہ عدم گنجائش مزید شکرموں کی منظوری کی توقع نہیں رہی۔ ممکن ہے کہ محکمہ تعلیمات مجبور ہو لیکن ملک کی معاشرت اور تمدن اور مذہبی احساسات کے پیش نظر یہ تجویز کہ ایسی بے پردہ لڑکیاں جن کی عمر ۸ سال سے کم ہو اور جبکہ مدرسہ مکانات سے تین فرلانگ کے فاصلہ پر ہو سواری سے محروم کی جائیگی قطعاً مناسب تھی اس لئے کہ حیدرآباد میں مسلمانوں بالخصوص بعض مہذب و گھرانوں میں بالعموم پردہ کو

اسی قدر وقت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک قرن پہلے دیکھا جاتا تھا۔ یہ کوئی رحمت پسند شخص یا قوم پرستی نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ یہاں یہ مسئلہ نہیں کہ دولتمند اس حکم سے متاثر ہوں گے یا نہیں، سوال سوتولیں اور غریب شرفا کا ہے۔ دولتمند اور صاحب استطاعت تو اپنی ذاتی سواری کا انتظام کر سکتے ہیں لیکن اس غریب کے لئے یہ سوال بہت اہم ہے جو اپنی آٹھ سالہ لڑکی کو خواہ وہ بے پردہ ہی کیوں نہ ہو دو تین فرلانگ تک تہا بھیجنے کے لئے مجبور کی جا رہی ہو۔ جبکہ وہ اس قدر استطاعت نہیں رکھتی کہ ایک ملازم کو اپنی بچی کے ساتھ بھیج سکے۔

ایسے زمانہ میں جبکہ بڑی کاوش اور حکومت کی مسلسل کوشش کے بعد پردہ کرانے والے گھرانوں میں لڑکیوں کو مدرسہ بھیجنے پر آمادگی کیجانے لگی تھی اس قسم کی رکاوٹ بڑا زبردست قومی نقصان ہے۔ ابھی تو جبکہ ہمارے ملک میں مدرسہ جانے کے قابل عمر کے طلباء و طالبات کی تعداد کا صرف ۱/۱۰ فی صدی حصہ تسلیم پا رہا ہے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے تو پھر آئندہ تعلیمی رتنی میں طرح طرح کی رکاوٹوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

اس لئے اگرچہ یہ تحریک بظاہر معمولی معلوم ہوتی ہے مگر دراصل نسوانی تعلیمی رتنی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ہماری نسوانی تعلیم کے موجودہ رفتار رتنی کے پیش نظر اس میں ذرا سی رکاوٹ ایک عظیم ترین قومی گناہ ہے ہمیں توقع ہے کہ محکمہ تعلیمات کی کھیتی جو اس پر تجویز کرنے کے لئے مبنی ہے ضرور بہترین صورت پیدا کرے گی۔ میں اس تحریک کی منظوری کی استدعا کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں شکرموں کا رواج ہے جو ب سے کم خرچ سواری ہے ہم تو یہ توقع رکھتے تھے کہ حکومت زیادہ تیز رفتار اور بہتر سواری کا انتظام فرمائیگی۔ بجائے اس کے موجودہ سواروں کا یہی انتظام نہ ہو سکے تو ہماری بدبختی ہوگی اس لئے ہم اپنی عزیز حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف موجودہ انتظام کو زیادہ وسیع فرمائے بلکہ زیادہ بہتر سواری کا انتظام فرمائے ورنہ ملک میں پردہ نشین گھرانوں کی تعلیم کا خدا حافظ ہے اور خوف لگا ہوا ہے کہ کہیں اس ذرا سی تجویز سے اچھے اچھے جو ہر فائدہ ہو جائیں۔

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے اس کی تائید میں کہا کہ

جناب صدر مغرز حاضرین!

میرے دوست مولوی عبدالرؤف صاحب۔ ی۔یل۔یل بی ویل نے اس تحریک کے متعلق تفصیل سے دھتھا کر دی ہے، اس لئے مجھے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس وقت ہمارے یہاں دو قسم کی سواریاں ہیں، تیز رفتار اور سست رفتار، تیز رفتار میں موٹر، موٹر سیکل وغیرہ شامل ہیں، سست رفتار میں گھوڑے گاڑیاں، شکارا، بنڈیاں وغیرہ شامل ہیں، شکارا عام طور سے عورتوں خصوصاً

مدرسہ کی لڑکیوں کے لئے مخصوص ہے آج سے تیس بیس سال پہلے بھی ہمارے یہاں دو قسم کی سواریاں تھیں۔ تیز رفتار میں ہر قسم کی گھوڑے گاڑیاں اور سست رفتار میں شکر ام اور میا نے وغیرہ تھے، موٹر کا وجود نہیں تھا۔ اس تیس بیس سال کے عرصہ میں دنیا بہت کچھ بدل گئی ہے لیکن یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہماری لڑکیوں کے لئے وہی تیس سال پہلے کی سواری مخصوص ہے، اس امر کی ضرورت ہے کہ مدرسہ کی لڑکیوں کے لئے بھی ٹرولر کا انتظام کیا جائے، جبکہ عثمانیہ کالج کے لڑکوں کے لئے ریلوے موٹر کا انتظام ہے تو لڑکیوں کے لئے بھی اسکا انتظام ہونا نہایت ضروری ہے۔ لہذا اس تحریک کی تائید کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ تمام اصحاب اس تحریک کو اتفاق منظور فرمائیں گے۔ بالآخر تحریک بالاتفاق منظور ہوئی۔

بعد ازاں مولوی محمد امرا اللہ صاحب صدیقی بیرٹرائٹ لانے تحریک ذیل پیش کی۔

”اس کانفرنس کی رائے میں اس امر کی ضرورت ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں اس بات پر توجہ کی جائے کہ ان میں اعلیٰ اخلاقی معیار پر ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہونے کے ساتھ گھریلو زندگی کے ہر پہلو سے بھی ان کو آگاہی حاصل کرنے کا موقع حاصل ہو اور ان کے تعلیمی زمانہ میں ان کے مشاغل و ورزشی کی نسبت ملک و قوم کے قدیم اخلاقی روایات کو نظر انداز نہ کیا جائے“ کانفرنس کے سرکاری نے اس تحریک کی تائید کی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔ اس تحریک کے منظور ہونے پر تحریک مندرجہ ذیل پیش ہوئی۔

”اس کانفرنس کی رائے میں اس امر کی ضرورت ہے کہ بلوہ حیدر آباد کے مدرسہ فوقانیہ نسواں نام پٹی میں عثمانیہ میٹرک کی تعلیم کا انتظام اس سلسلہ کی ساری جامعیتوں اول سے دہم تک قائم کر کے عمل میں لایا جائے“ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے یہ تحریک پیش کرتے ہوئے بیان کیا کہ۔

جناب صدر و حضرات!

جو تحریک آپ کی خدمت میں پیش ہوئی ہے، وہ بہت اہم ہے، اور اس قدر واضح ہے کہ مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے

یہ امر آپ سے مخفی نہیں کہ ملک میں تعلیم کا اب عام طور سے چرچا ہو گیا ہے اور نہ صرف مرد بلکہ ان کے دوش بدوش عورتیں بھی تعلیم کی جانب متوجہ ہوتی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کے شوق تعلیم کے رجحان کا پتہ اس سے مل سکتا ہے کہ جہاں آج سے پچیس سال پہلے جملہ مدارس نسواں کی تعداد ملک سرکار عالی میں صرف (۸۴) اور طالبات

کی تعداد (۵۵۳۴) تھی، وہاں آج سیکڑاٹ کے اعداد کے لحاظ سے مدارس نسواں کی تعداد (۶۳۶) اور طالبات کی تعداد (۵۵۰۰۰) ہے ان اعداد میں کالج میں تعلیم پانے والیں طالبات شریک نہیں ہیں۔

شوق علم کا یہ رجحان نتیجہ ہے جامعہ عثمانیہ کی تحریک کا عام طور سے طلبہ کار حجان اسی تعلیم کی کی جانب ہے۔ اور ملکی زبان میں تسلیم پانا تو ہر حیثیت سے زیادہ مفید اور سودمند خیال کیا جا رہا ہے۔

بلکہ حیدرآباد میں لڑکوں کو جامعہ عثمانیہ کے سلسلہ کی تعلیم دینے کے لئے کئی فو قانیہ مدرسے قائم ہیں جن میں طلبہ کی تعداد روز افزوں ہے۔ اس کے برخلاف عورتوں کو جامعہ عثمانیہ کے سلسلہ کی تعلیم دینے کے لئے صرف ایک مدرسہ فو قانیہ ہے جو اندرون شہر واقع ہے۔

نام بی کے زمانہ مدرسہ میں صرف میٹرک کی تین جماعتوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ جماعت اول سے جامعہ عثمانیہ کے سلسلہ نصاب کی تعلیم نہیں ہوتی۔ بلکہ اسکول فائیل کے سلسلہ درس کا انتظام ہے۔

نام بی کے اس سہ کاری مدرسہ کے علاوہ ثانوی گز زما نی اسکول اور سکندر آباد کے دو مدرسوں میں اسی نصاب اسکول فائیل کی تعلیم ہوتی ہے۔

عام طور سے تعلیمی شوق اور پبلک کے رجحان کے مد نظر ضرورت اس امر کی ہے کہ نام بی کے اتنی اگے میں بھی ابتداء سے جامعہ عثمانیہ کے سلسلہ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

اس کی وجہ نہ صرف یہ ہے کہ عام طور سے جامعہ عثمانیہ کی تعلیم ہر دل عزیز ہو رہی ہے اور اس کے لئے ایک مدرسہ فو قانیہ کافی نہیں ہے۔ بلکہ اور ایک وجہ بھی ہے جکی بنا پر اس بات کی ضرورت ہے کہ نام بی کے مدرسہ میں ابتداء سے درس عثمانیہ کا انتظام کیا جائے۔

نام بی کے مدرسہ میں جامعہ عثمانیہ کی تعلیم ابتداء سے نہ ہونے اور صرف میٹرک کی آخری تین سالوں کے درس کا انتظام ہونے کے باعث نتائج امتحان اچھے نہیں ہوتے چنانچہ گزشتہ پانچ سالوں کے اعداد سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کامیاب

شریک

ایک

۳

+

۴

۲

۸

۱۳۴۳

۱۳۴۴

۱۳۴۵

۱۳

۴

۴

۴

۳۵

۱۱

اس کے مقابل چونکہ اسکول فائیل کی تعلیم کا ابتدا سے انتظام ہے اس لئے اس گزشتہ پانچ سال کے اعداد بھی قابل تذکرہ ہیں۔

کامیاب	شریک	۳
۳	۳	۳
۶	۶	۵
۵	۶	۶
۴	۷	۷
۸	۱۱	۷
۲۶	۳۳	پانچ سال

ان اعداد سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امتحان میں شریک ہونے والی لڑکیاں بمقابل اسکول فائیل کے امتحان کے عثمانیہ میٹرک میں زیادہ شریک ہوئی ہیں۔ لیکن نتیجتاً اسکول فائیل کے کامیاب لڑکیوں کا اوسط زیادہ اچھا رہا ہے۔

جو اعداد عثمانیہ میٹرک کے پیش کئے گئے ہیں ان سے یہ شبہ نہیں کرنا چاہیے کہ یہاں تعلیم اچھی نہیں ہوتی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہاں میٹرک میں شریک ہونے کے لئے عموماً دوسرے مدارس سے طالبات آتی ہیں جو انگریزی وغیرہ مضامین میں کم زور ہوتی ہیں اور یہاں وہ اپنی کمی کی تکمیل نہیں کر سکتیں۔ لہذا اگر ابتدا ہی سے ناپہلی کے مدرسہ میں سلسلہ عثمانیہ کے تعلیم کا انتظام کیا جائے تو یہ نقص دور ہو سکتا ہے۔ اور شروع سے ہی طالبات درس عثمانیہ میں تعلیم پا کر میٹرک کا امتحان اچھی طرح دے سکتی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ اصحاب اس تحریک کو بالاتفاق منظور فرمائیں گے۔

مولوی عبدالرزاق صاحب مجھے بی۔ اے نے اس تحریک کی تائید کی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔

اس کا ردوائی کے اختتام پر پروفیسر ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب بی بی سی ڈی صدر شعبہ فارسی

جامعہ عثمانیہ کے ”ادبیات جدید ایران“ پر ایک مقالہ سنایا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ایران جدید کی شاعری

سرزمین ایران آغاز تمدن سے مشرق و مغرب کے خیالات کی آماجگاہ اور آریائی اقوام کی کشمکش کی جولان گاہ بنی ہوئی ہے۔ اس پانچ ہزار سال کی طویل مدت میں عیلامی، آسوری، میس، ہخامنشی، یونانی، اشکانی، ساسانی، عرب، سلاجقہ، منول، افغان، ترک اور ایرانی نسل کے سلاطین کے بعد دیگر حکمران رہے ہیں۔ فرمانرواؤں کی سرپرستی میں ایران سیاست و ریاست، تہذیب و تمدن، علوم و فنون، صنعت و حرفت، زبان و ادب کے ارتقائی منازل طے کرتا رہا۔ انہیں صنایع کے زرین کارنامے ہیں جنکے گہرے نقوش جریدہ عالم پر ثبت ہیں۔ اس زمانہ دراز میں کبھی مشرقی اثر غالب رہا تو کبھی مغربی اثر۔ اور یہی سلسلہ اب تک جاری ہے۔

سلطنت ایران داریوش کبیر کے عہد میں وسط ایشیا سے وسط یورپ تک پھیلی ہوئی تھی۔ جانب مشرق سیحون اور دریائے سندھ اور جانب مغرب دانیوب اور ساحل نیل واقع تھا۔ سکندر اعظم کی فتوحات سے مغرب کی قیادت کا علم بلند ہوا۔ ایران کے تمدن پر یونانی اثرات غالب آگئے۔ ساسانی عہد میں ایران نے اپنے آریائی تمدن کو پھر بام عروج پر پہنچا دیا۔

ساتویں صدی عیسوی میں عربوں کے حملے سے ایران کی تاریخ میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہو گیا اور اسلامی پرچم کے سایہ میں توحید کا نغمہ بلند ہو۔ سادات اور حریت کی روح ایران کی رگ و پے میں سراٹم کر گئی۔ قوم کے خیالات میں پاکیزگی، فلسفہ و حیات میں تازگی، غزم اور ارادوں میں بلندی، زبان و ادب میں انتہا درجہ وسعت اور تہذیب و تمدن میں غیر معمولی رونق پیدا ہو گئی۔ عربیت کا دور دورہ رہا۔

خلفا بنی عباس کے عہد میں اہل علم اور اہل عرب کے میل جول سے تمدن انتہائی نقطہ عروج پر پہنچا۔ بعض خالص ایرانی النسل خود مختار سلطنتوں کی سرپرستی میں محبت کو خاصا فروغ ہوا مگر اسلامی مرکزیت میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ سلاجقہ نے ایران کی عظمت کو تازہ اور اسلامی ایشیاء کو متحد کر دیا۔ افغانستان سے بحرہم تک انکی فرمانروائی جاری تھی۔ ان کے شاندار کارنامے کو تاریخ عالم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

تیرھویں صدی عیسوی میں مشرق پر ایک بڑی آفت نازل ہوئی۔ تاتاریوں کے سیلاب نے ایشیائی تمدن کو تہ و بالا کر دیا۔ چنگیز، ہلاکو خاں اور ان کے جانشین منول نے اسلامی آثار اور ایرانی تمدن کو تباہ و برباد

کر دیا۔ مگر ایرانیوں نے جس طرح عربوں کو اپنے تمدن سے سخر کر لیا تھا اسی طرح ایغمانی منول بھی ایرانی تمدن کے حامل اور عامی بن گئے۔

اس جنگجو اور طاقتور قوم کی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یورپ کی زبردست سلطنتیں حروب صلیبیہ کے زمانہ میں ان کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش کرتی تھیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں پھر ایران میں وطنی جذبہ پیدا ہوا اور صفوی سلطنت کے سایہ میں ایران کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ ترکوں کے مقابل میں مغربی سلطنتیں صفویوں کو اپنا پشت پناہ بنانا چاہتی تھیں۔ ایران قاجاریوں کے عہد میں یورپ کی استعماری سیاست کا شکار اور انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں روسی اور برطانوی رقابت کا کھانچہ مشق بنا ہوا تھا۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں ایران انتہائی تنزل کو پہنچ چکا تھا اور اب اس کے اقبال کا ستارہ غروب ہونے کو تھا کہ رضا شاہ پہلوی آفتاب مشرق کی طلع طلوع ہوا اور ایران کو پھر مشرق و مغرب کا محور اور جدید تمدن کا طرفدار بنادیا۔

مشرقی ممالک کے دورِ ترقی میں سیاسیات کے ساتھ ادبیات کو بہت بڑا دخل رہا ہے۔ عربوں کی ترقی کا راز ان کی زبان اور ادب میں مضمر ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں عربی زبان نے عام دنیا کی تہذیب و تمدن، مذہب و فلسفہ، علوم و فنون کی جس قدر خدمت کی اس کے اعتراف میں آج تک مورخین عالم رطب اللسان ہیں۔ اسکے بعد فارسی زبان کا رتبہ ہے۔ سوائے چند جدید فنون اور ڈراما کے کوئی اور علم یا فن نہیں جسکے بیش بہا خزانے لازوال شاہکار اور موثر ترین نمونے فارسی زبان نے پیش کر سکتی ہوئے مشرق اور مغرب کی زبانوں میں عام نقطہ نیل کے مطابق فارسی اور فرانسیسی ہی دو ایسی زبانیں ہیں جو انتہا درجہ شیریں نغمہ انگیز اور دل آویز سمجھی جاتی ہیں۔

ثقافتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو نوعِ بشر کی جالیاتی ترقی، روح انسانی کی اصلاح، مذہب و فلسفہ کی ترویج و تعلیم، میزانِ حیات اور معیارِ فکر کو بلند کرنے میں فارسی زبان نے جو خدمات انجام دی ہیں، شاید ہی کوئی مشرقی زبان اس کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ ان ہی وجوہ سے آج ہم فارسی زبان اور اس کے ادب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے اور اس کے حامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فارسی زبان کی اہمیت کا ثبوت ہر دور کی تاریخ سے مل سکتا ہے مگر فارسی حویٰ بہترین ترجمان بنی رہی۔ اس نے کئی دنگ بدلے مگر اس کا اصلی جوہر ہر دور میں باقی رہا۔ اس کی ابتدا نوینِ ضدی عیسوی میں طاہریوں اور صفاریوں کے زمانہ میں ہوئی۔ سامانیوں کے عہد میں شہید بلخی، رودکی اور قنبری جیسے شعرا نے اسکی

بنیادوں کو مستحکم کیا اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزنوی ہمدیں رزم و بزم کی مخلص اسی سے گرم ہیں۔ فردوسی، عنصری، منوچہری، فرخی، اسدی نے مدحیہ اور رزمیہ شاعری کو رونی بخشی۔ خوارزمشاہیوں اور سلجوقیوں کی سرپرستی میں اس کو عروج نصیب ہوا۔ مغزی، انوری، خیام، سنائی، خاقانی، ہلمیر فارابی، نظامی گنجوی، ناصر خسرو جیسے زبردست سخنور پیدا ہوئے اور ادبیات عالیہ کو انتہائی نقطہ پر پہنچا دیا۔ ان متقدمین کے کارنامے فارسی ادب کے لازوال شاہکار ہیں۔

مغول کے حملہ کے بعد سعدی اور رومی نے دنیا کی بے ثباتی اور عالم اسلامی کی تباہی کا نقشہ پیش کر دیا۔ اسی سیاسی کشمکش کے دور میں عراقی، ابن یمن، حافظ، سلمان ساوجی اور جامی نے تنگن معرفت کو شوق حقیقی کے نغمے سنارست کر دیا۔ طبقہ متوسطین کے شعراء نے فارسی شاعری کو تباہی سے بچا لیا اور متقدمین کے رنگ کو قائم اور علم و ہنر کو زندہ رکھنے کی ان تھک کوشش کی۔ بعض موانعات کی وجہ سے صفویہ عہد میں فارسی شاعری ترقی نہ کر سکی۔ تاہم یہ زمانہ بھی اساتذہ سے خالی نہیں فنانی، عرفی، نظیری، صائب، خزین نے شعر و سخن کے میدان کو وسیع کیا اور ایرانی ادب کے وقار کو قائم رکھا۔

اسی زمانہ میں ہندوستان نے فارسی ادب کی بڑی خدمت کی شاہانِ معلیہ اور اکبر کا دربار رشک ایران بنا ہوا تھا۔ ابوالفضل اور فیضی دو ایسے نام ہیں جو فارسی کی تاریخ ادبیات میں ہمیشہ زندہ رہینگے۔ انیسویں صدی عیسوی میں فارسی شاعری نے جدید اثرات کے تحت ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ قافانی نے فارسی شاعری کی کایا پٹ دی۔ اس دور میں مہر اردستانی، صبا کاشانی، نشاط اصفہانی، وصالی شیرازی، فروغی بطامی، یغما جندق، رضا علی خاں اور چہر نے یہ کوشش کی کہ فارسی زبان میں متقدمین جیسے طبقہ اولیٰ کے شعراء کا رنگ پیدا کریں۔ انہوں نے شعر و سخن کو خیالات کی پیچیدگی، استعارات اور تشبیہات کی فرسودگی، عقلی اصناعی، بعد از عقل مضامین، دور از کار تخیل اور بے جا آوردے پاک کیا۔ زبان میں سلاست اور روانی، مطالب میں شگفتگی، طرز ادا میں دلکشی، ماحول سے قربت، مضامین میں وقہیت اور فطری مناسبت، تشبیہات و استعارات میں شگلی و شائستگی، کردار نگاری و واقعہ نگاری میں جزئیات و لوازم کا صحیح توازن، تخیل و محاکات میں بلند پروازی اور جذبات میں صداقت اولوالعزمی پیدا کی قافانی کو اس دور کی قیادت کا شرف حاصل ہے جسکی طرف انگریزی اور رنم ریزی کے موجودہ شعراء منون ہیں۔

غرض فارسی شاعری نے نوین صدی عیسوی سے انیسویں صدی تک مختلف اصناف سخن،

قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، ترجیع بند، مسطعا، مستزاد، وغیرہ کے ذریعہ مدحیہ، ہجائیہ، عشقیہ، فلسفیہ، اخلاقیہ، صوفیہ، رزمیہ، بزمیہ، امرائی، محاکات، افسانہ نگاری، تاریخ نویسی اور جن کاری کے بے مثل نمونے ہمیا کر دے۔ متقدمین، متوسطین اور متاخرین نے آنے والی نسلوں کے لئے ایک لازوال ورثہ چھوڑا ہے۔ قصائد انوری و خاقانی، شاہنامہ فردوسی، رباعیات عسمر خیام، دیوان ناصر خسرو و سعدی، مثنوی مولانا جامی اور غزلیات عراقی، حافظ و جامی ایسے شہکار ہیں جو دنیا کی ممتاز ترین تصانیف یا ادبیات عالیہ میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔

فارسی شاعری میں صرف مضمون ایسے رہ گئے تھے جن پر سابق شعراء نے طبع آزمائی نہیں کی تھی۔ ایک تمثیل نگاری و دیگر قومی اور سیاسی شاعری۔ تمثیل کا میدان ابھی تک خالی ہے۔ طریقہ اور خرنیہ کی چیدہ چیدہ مثالیں تعزیه اور تصنیف میں ملتی ہیں۔ مگر ایک ٹیکسیر ایک مولیر اور ایک گوئٹے کی جگہ ابھی ایران میں خالی ہے۔

قاچاریوں کے عہد میں ایران خواب غفلت سے جاگا اور تمدن مالک کے ہمدوش ہوئے کی کوشش کی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ایرانی شعراء نے ملک اور قوم کے احساسات و جذبات کے ابھار اور جہود و غفلت کو دور کرنے میں جو نمایاں حصہ لیا ہے وہ تاریخ عالم میں زرین حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ موجودہ صدی کے ابتدائی بیس سال میں سیاسیات کا جو طوفان ایران میں برپا رہا اس نے حساب دلوں پر نشتر کا کام کیا۔ شعراء جو قومیت کے معیار اور جدید تحریکات کے علمبردار ہوتے ہیں اس غیر متوقع انقلاب سے بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر آشوب زمانہ کی سرگزشت سے شعر و سخن کو مالا مال کر دیا اس مدت میں کئی ایک ایسی قومی اور وطنی نظمیں لکھی گئیں جو تاثرات قلبی کی جیتی جاگتی تصویر اور ایرانی قوم کی بیداری و وطن پرستی اور آزادی کا بے نظیر مرقع ہیں۔ اس عبوری دور کی شاعری اپنی زبان حال سے ایرانیوں کے متضاد جذبات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ امید و بیم، شکوہ و شکایت، استبدادیت و جمہوریت، قوم کی بستی و بلندی، فتنہ و شکست، ترقی و منزل کی مختلف کیفیات جو وقتاً فوقتاً ملک و قوم پر طاری ہوتی رہی ہیں وہ اس زمانہ کی شاعری کا اصلی موضوع بنی ہوئی ہیں۔

نسیم شمال، گیلان، کنکاش، صدائے رشت، بہار، صورا سرافیل اور ایران نو کے صفحے اس درد کی کہانی اور ایران کی ویرانی کے فکر سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ نظمیں اکثر سیاست حاضرہ، وقتیت

مسائل اور ماحول کے جذبات سے معمور ہیں مگر ان میں بھی ادبیت کی روح اور معنویت کا جوہر پایا جاتا ہے، ان ہی نظموں کے باعث ایران میں ایجان پیدا ہوا اور یہی نظمیں انقلابی ادب کا سرمایہ بن گئیں۔

اس دور کے ممتاز شعراء ادیب پشاور، شوریدہ شیرازی، ادیب الممالک فرہانی، محمد دولت آبادی، ادیب نیشاپوری، گمالی اصفہانی، اشرف گیلانی، ایرج مرزا حین دانش، وحید و سنگری، ناد، عارف قزوینی، منہنگ سالار شیرازی، پور داؤد، بہار مشہدی، اور فرخ یزدی ہیں ان ہی نے اپنے شراذیمزمنوں سے استبدادیت کو فنا کر دیا اور ملک و قوم کو نئے دورہ حیات اور ادبی، معاشرتی، سیاسی، وطنی نشات کے لئے تیار کر دیا۔

جب ہم ان سیاسی سماجی اقتصادی اور تمدنی تحریکات، اور ایران کی بین الاقوامی حیثیت، قومی اقتدار کی سر بلندی، سیاسی عظمت، حکومت کی مستحکم اور آزادانہ روش، فوجی قوت کی برتری، بیرونی تعلقات کی استواری، اعلیٰ نظم و نسق، مملکت، نئے نئے محکموں کی تنظیم و تشکیل، قانون و عدالت کی اصلاح، علم و ہنر کی شاہانہ سرپرستی، تعلیم و تربیت کی غیر معمولی ترقی، آثار قدیمہ کی حفاظت، قدیم رسوم و رواج کی قدر و دید، لوازم زندگی کی فراہمی، مال و دولت کی افزونی، حل و نقل کی سہولت، امن و امان کی ضمانت، تجارت، صنعت، زراعت و حرفت کی حالت، ورزش جسمانی اور حفظ صحت کی اہمیت، جہالت اور تعصب کی بے بسی، سوسائٹی کی مادی اور معنوی اصلاح، قومی جشنوں کا انعقاد، اور ایرانیت جدید کی تعمیری نظام عمل، باریک غائر نظر دہشتے میں تو عصر پہلوی کو ایران کی تاریخ کا زرین عہد اور شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کو مشرق کا ایک بڑا ستارہ نجات دہندہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس قائد اعظم کے سایہ عاطفت میں گزرا ادب بھی نئے نئے گہائے مضامین سے آراستہ کیا جا رہا ہے اور شعر و سخن کا میدان وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ تخیل میں بلندی، زبان میں دل آویزی، اسلوب بیان میں جدت، جذبات میں جوش، حقائق و معارف کی جستجو کے علاوہ، ماحول کی فطری توجہ جانی اور معیار فکر کی تبدیلی، یہ چند عناصر ہیں جو ادبیات جدید ایران کی روح رواں ہیں۔

جس نفسیاتی ماحول میں اس وقت ایران کی قومیت پرورش پا رہی ہے وہ ان اثرات کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں جو قدامت پسند اوبار کی نظر میں شعر و سخن کا زیور سمجھے جاتے تھے۔ نہ وہ باریک بینی سے نہ وہ خیال آفرینی نہ وہ خوشگانی نہ وہ بلند پروازی اور مبالغہ آرائی، اور نہ وہ صنعت گری و طرب انگیزی، شاعری افادیت اور قومیت کا مظہر بنی ہوئی ہے۔

موجودہ دور کے شعراء کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شاعر تمام انقلابی تحریکوں سے متاثر ہو رہا ہے جو ملک میں سرعت کے ساتھ رائج ہو رہی ہیں ایران جدید میں معنویت و معنویت آزاد خیالی اور قدامت پرستی و دعائیت و مادیت، مذہبیت اور سائنس پرستی، مشرق و مغرب، آریائی و سامی (عربی) پرستیت و اسلامیت، جمہوریت و آمریت، اشتراکیت و اشمائیت، شاہ پرستی و قوم پرستی، آزادی نسوان اور پردہ پرستیت و اختلاف لباس و معیشت کی ذہنی جنگ جاری ہے۔ ان امور کے متعلق قوم غور و فکر کر رہی ہے اور ان مسائل کے حل کرنے میں مصروف ہے۔ شاعر جو نگاہ اپنے عہد کا حقیقی نمائندہ ہوتا ہے اور اسکی انفعالی قوت بیرونی اثرات کی مدافعت کا حقہ نہیں کر سکتی اس وجہ سے وہ مجبوراً ان مضامین کو اپنا موضوع سخن بنالیتا ہے۔

اگر مضامین کی نوعیت اور طرز بیان کے اعتبار سے موجودہ دور کے شعراء کی طبقہ بندی کی جائے تو تین طبقے قرار دئے جاسکتے ہیں۔

(۱) قدامت پسند (۲) جدت پسند (۳) بہتکمرین

قدامت پسند شعراء قدیم اسالیب اور قدیم قواعد عروض کے پابند اور متعین مثل منوچہری فردوسی سعدی اور حافظ کے تقلید میں مضمون کے اعتبار سے ان کی شاعری جن و عشق سے تجاوز کر کے فلسفہ اخلاق اور قومیت و سیاست پر بھی شامل ہے۔ اس زمرہ کے ممتاز شعراء یہ ہیں ادیب پناوری، شوریدہ شیرازی، ادیب الممالک، فراہانی، ادیب مینا پوری، شمع الملک، غلام ہمدانی، نادری، شہیدی، فروغی، سالار شیرازی، بدیع الزماں خراسانی، ان کا کلام نہایت پختہ ہے۔ ترکیبیں اور بندشیں نہایت مضبوط محاورات و اسالیب قدیم قصیدہ، غزل، ثنوی، رباعی غرض جن صنف سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اس کے لوازم کی بھی سختی سے پابندی کی ہے اور اس کا حق ادا کیا ہے۔

دوسرا طبقہ ان شعراء کا ہے جو قدیم اوزان اور اصناف شعر کی پابندی تو کرتے ہیں مگر ان کے خیالات اور مضامین مغربی طرز پر ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ اور ان کا کلام بھی بہ کثرت دستیاب ہو سکتا ہے۔ سنخوڑاں ایران و دہر حاضر سنخوڑاں، پلوئی، ادبیات معاصر، رشید یاسمی ان کی انگوٹوں سے معمور ہے۔ اس طبقہ پر قومیت کا اثر بے حد غالب ہے۔ بسا اوقات اس جذبہ کے تحت اسلامی تمدن کو نظر انداز اور قدیم ساسانی روایتوں کو مازہ کرنے کی ان تھک کوشش کی جا رہی ہے۔ اس جدت پسند طبقہ کی آزاد خیالی مطلق العنانی کے درجہ کو پہنچ گئی ہے

ان میں یحییٰ دولت آبادی، کمال مہربانی، اشرف گیلانی، ایرج مرزا، کسائی، افسر، دھند، دمقان، پور داؤد، اوزنگ، بامداد، نظام وفا، فرخی یزدی، بادی حایری، شفق رضا زادہ، افشار، ریحان طهرانی، دانش خراسانی، حام زادہ بازار گاد، پڑمان، مختاری، صورتگر، فلسفی، حبیب یمنائی، شہر یار سرد، پردیس، اعتصامی، طلیعی اور نصرت کاشمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تیسرا طبقہ ان شاعروں کا ہے جو فارسی شاعری کے میدان کو وسیع کرنے اور ہمیں نئے صنف اور خیالات کے اضافہ کرنے کے بانی و حامی تصور کئے جاسکتے ہیں۔ انکی تعداد بہت کم ہے۔ مگر ان کا اثر موجودہ شاعری کی نشوونما پر بے حد موثر ہے۔

اس طبقہ کے چار ممتاز شاعروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ عارف قزوینی، عشق بہار، شہیدی اور رشید یاسمی ان میں سے پہلے دو کا انتقال ہو چکا ہے۔ عارف کی "تصفیق" و "عشق" کی ریختہ و ایدیاں (خیالی) موجودہ دور کی شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ تصور کئے جاتے ہیں۔ ملک اشعار بہار، شہیدی ان چند اساتذہ فن میں سے ہے جس نے گرم و سرد روزگار کے مزے خوب چکھے ہیں۔ انقلابیوں کے ساتھ سردار دادرگری کے سر پر خاک اڑانی ہے تو جنگ جہانگیر میں روزنامہ نو بہار کے ذریعہ حکومت وقت کی سخت تنقید کی۔ پہلو گو دو میں شاہ کی مدح میں قصیدے لکھے اور جشن فردوسی کے موقع پر قومی ترانہ گایا۔ کئی دفعہ قید کیا گیا اور وکیل مجلس مقرر ہوا۔ اب استاد سخن اور ادیب عصر مانا جاتا ہے۔

بہار جدید یورپی شاعری سے واقف ہونے کے علاوہ پہلی زبان پر کافی عبور رکھتا ہے۔ قدیم اسالیب میں اسے کامل قدرت حاصل ہے مگر جدید طرز میں کہنے کو بے حد پسند کرتا ہے۔ اسکی تشبیہات نہایت ہی لطیف و ترکیبیں سادہ اور فطری ہوتی ہیں۔ اسکی شاعری میں ریاضی و نیا جو لازم دونوں شامل ہیں۔ ماحول کے گہرے مطالعہ اور قدرتی مناظر کی تصویر کشی میں اسکو کمال حاصل ہے۔ زبان کی شگلی کا اس کو بے حد خیال ہو، مثلاً "دماوند، گیلان، مازندران" مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ساسانی روایات اور عاص آریائی تمدن کی حمایت میں آج کل پیش پیش نظر آتا ہے۔ گو پور داؤد کی طرح زرتشتیہ کا مبلغ تو نہیں مگر شدید اضرور ہے۔

رشید یاسمی بھی ان نوجوان مگر بیدار مغز شعراء میں ہے جو مغربی اثرات کے تحت فارسی شاعری میں نئی روح پیدا کرنے کی بے حد کوشش کر رہے ہیں۔ حال ہی میں اس نے اپنے منتخبات شائع کئے ہیں جن قطعات

عزلیات اور بطوں پر تال ہے۔ ان میں سے اکثر فرانسیسی شعراء کی طرز کی نظمیں ہیں۔

آخر میں ایران کی زبردست شاعرہ پروین اعتصامی کا ذکر کئے بغیر اس مضمون کو ختم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ میرے خیال میں پروین ان چند تلامذہ الرحمن میں سے ہے جو ہم میں اللہ موتے ہیں۔ اس کی نظموں کے عنوان جدید خیالات جدید ہیں مگر زبان نہایت پختہ اور مستحکم ہے۔ اپنے معاصرین کی طرح ویو رینی محاوروں اور خیالات کی نفعی کرنا پسند نہیں کرتی بلکہ طبعی جدت کے ساتھ اوزان و اسالیب کی سختی سے پابندی کر کے ہمعصروں پر یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ فارسی زبان نازک ترین اور عالی ترین خیالات کی کس طرح حامل ہو سکتی ہے۔ اس مقالہ کے سنائے جانے کے بعد صغیر اہایوں مرزا ابلیس صاحب نے یہ تحریک پیش کی۔

”اس کا نفرنس کی رائے میں امر بہت ضروری ہے کہ ممالک

محمودہ سرکار عالی کے مدارس کے لئے بالعموم اور مدارس

نواں کے لئے بالخصوص کشادہ اور وسیع مکانات مہیا

کئے جائیں جن میں کھانے کے لئے علیحدہ کمرے مختص ہوں

اور صبح صحن بھی موجود ہوں“

تحریک کو پیش کرتے ہوئے محمد کے نے بیان کیا کہ

جناب صدر و حاضرین!

میں یہ ردیویشن پیش کرتے ہوئے مختصر سی تقریر کرونگی کیونکہ لمبی چوڑی تقریر سننے سے لوگ اکتا

جاتے ہیں اور بولنے والے کا وقت بھی بیکار اس نے کہ تقریر میں دو چار نکات ہی ہوا کرتے ہیں صرف

الفاظ کی خوبصورتی کی وجہ تقریر کا سلسلہ گھنٹوں رہتا ہے اس سے تقریر بڑی ہو جاتی ہے۔

تعلیم ایک ایسی چیز ہے کہ انسان تو انسان اگر جانور کو بھی تعلیم دیں تو وہ ان کی طرح کام کر سکتا ہے

دیکھو نہنی سی مینا کس خوبی سے آدمی کی بولی بولتی ہے طوطی بھی آدمی کی بولی بول سکتی ہیں بلکہ سرکس میں طرح

طرح کے کھیل جانور کیا کرتے ہیں یہ کس لئے صرف تعلیم کے سبب صرف وہی نہیں پہلے زمانہ میں نابرتی کا کام

کبوتر سے لیا جاتا تھا ایک شہر سے دوسرے شہر تک کبوتر نامہ بری کرتے تھے فوج میں برابر کبوتروں کے

ذریعہ خطو طبعی جاتے تھے کتوں سے کام لیا جاتا ہے یہ سب تعلیم ہی کا سبب ہے

جب جانور انسان کی طرح تعلیم کی وجہ سے کام کر سکتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی تعلیم سے

خواطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ تعلیمی ڈگریاں تو حاصل کی جا رہی ہیں لیکن دوسرے شہروں کے مقابلہ میں حیدرآباد بہت پیچھے ہے تعلیم تو حاصل کر لیتے ہیں مگر اتنی تعلیم سے نہ آپ فائدہ اٹھاتے ہیں نہ دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

حاضرین! اسکی کیا وجہ ہے اس غور کرنا ضروری ہے میرے خیال میں اسکی یہ وجہ ہے کہ ہمارے لڑکے اور لڑکیاں جو تمام تمام دن اسکول میں گزارتے ہیں وہاں کی ہوا صاف نہیں ہوتی، گنجان محلہ میں اسکول رہتے ہیں کھیل کود کے لئے ان کو جگہ نہیں ملتی۔ لڑکوں پر کی گرد و غبار الگ صحت کے لئے خراب ہے۔ کھانا کھانے علیحدہ کمرے نہیں ہوتے۔ جب تک لڑکے اور لڑکیوں کی صحت کا خیال نہ رکھا جائیگا اس وقت تک تعلیم سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

فرض کرو ہمارے بچے بی۔ اے۔ ایم۔ اے ہو گئے اور ان کی صحت خراب ہے تو کیا وہ اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور کیا وہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ یا ملک کی خدمت کر سکتے ہیں۔ لیکن ہے کوئی یہ کہنے کہ ہم سب انہی اسکولوں سے تعلیم حاصل کر کے ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ خدمت خدمت میں فرق ہو یوں سپٹ پالنے بیمار آدمی بھی نوکری کر لیتا ہے میرے خیال میں گورنمنٹ کو چاہیے کہ چوکی تعلیم سے زیادہ انکی صحت کا خیال رکھے جب تک چوکی صحت درست نہ ہوگی اس وقت تک وہ تعلیم ابھی طرح حاصل نہیں کر سکتے اور نہ اپنی تعلیم سے دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

یورپ میں دیکھو تعلیم گاہیں اکثر کھلے مقامات میں ہوا کرتے ہیں صرف اسکول ہی نہیں بلکہ کارخانوں کے مکانات بھی کھلی جگہ بنائے جاتے ہیں تاکہ کارخانہ میں کام کرنے والوں کی صحت درست رہے۔ قدیم زمانہ میں صرف پڑھائی لکھائی بچوں کو لکھائی جاتی تھی موجودہ زمانہ میں دستکاری صنعت و حرفت باغ بانی۔ درزی وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ہمارے حیدرآباد میں جو مکانات اسکول کے لئے جاتے ہیں وہ خانگی ضروریات کے لئے جو مکانات بنائے جاتے ہیں وہی اسکول کے لئے لئے جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے بلکہ اسکول کے خیال سے مکانات بنائے جائیں۔ گنجان آبادی میں اسکول رہنے سے گرد الگ صحت کو خراب کرتی ہے دوسرے تمام دن موٹروں کی آواز سے پڑھائی میں سخت ہرج ہوتا ہے اسکول اٹیشن کے قریب یا کسی گرنی کے قریب نہ ہو کیونکہ اسکی آواز سے پڑھائی میں ہرج ہوتا ہے۔

میرے خیالات صرف تقریر کی حد تک نہیں بلکہ عملاً ہے۔ میں اسی خیال سے ہایوں نگو میں جو

اسکول بنایا ہے کھلے مقام پر کمرے بڑے بڑے ہوا دار کھیلنے کے لئے میدان وسیع ہے۔ میرے خیال میں اس طرح کھلے مقام پر سرکاری کوئی اسکول نہیں ہے یونیورسٹی کے اسکول چھوڑ کر باقی اسکولوں کا خیال کرو سب گنجان آبادی کے اندر واقع ہیں۔ افسوس کہ ہمایوں نگر کے زمانہ مدرسہ کی ترقی کے لئے سرکار کی توجہ نہیں اور نہ ہمارے لوگوں کو اس کی ترقی کی فکر ہے ابھی تک عمارت ناتمام ہے۔

گورنمنٹ کو چاہیے کہ اسکولوں کے مکانات کا خیال ضرور رکھے۔ گلی کوچہ میں اسکول نہ ہوا امید ہے نواب مہدی یار جنگ بہادر اور جناب سید محمد حسین صاحب ناظم تعلیمات اور جیسی نندی صاحبہ اہل طرف توجہ فرمائیں گے۔ امدادی مدارس ایک ایک محلہ میں دو دو تین ہیں اور امدادی کم مٹی ہے جسکی وجہ سے مکان بڑا لیا نہیں جاتا بہتر ہے کہ ایک مدرسہ ہو مکان اچھا ہو قریب قریب کے مدرسوں کو ملا دیا جائے

میں امید کرتی ہوں کہ یہ رزلوشن صرف پاس ہی نہیں بلکہ اس کو عملی جامہ پہنایا جائیگا۔

سنا ام شاہ نے انگریزی تقریر میں اسکی تائید کی ہے اور تحریک بالاتفاق منظور ہوئی۔

بعد ازاں ڈاکٹر سید حسین صاحب ام۔ اے پی بیج ڈی لہند نے ”حیدر آباد میں صنعتی ترقی کے امکانات“ پر جو تقریر کی اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

جناب صدر!

صنعت سے مراد ایسی اشیاء اور سامان کا تیار کرنا ہے جو ہماری ضروریات زندگی کے لئے لازمی ہیں مثلاً ہمیں عمدہ اور مفید غذا کی ضرورت ہے اسی طرح کے لئے مکان، پہننے کے لئے کپڑے، ارسل و رسال کیلئے سڑکیں، ریل، موٹر اور جہاز، صحت قائم رکھنے کے لئے ادویہ اور حفاظت اور مدافعت کے لئے آلات حرب۔ غرض کہ ہمارے آرام و آسائش کے لئے ہزار اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سب کی سب بیشتر کیمیا کی صنعت ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔

اتحادیوں صدی تک ہماری ضروریات ہم خود پوری کر لیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے بعد یورپ میں مشین اور ساتیں کے استعمال سے سامان زندگی کثیر مقدار میں اور ارزاں تیار ہو کر ہمارے ملک میں آنے لگا جس سے ہماری قدیم طرز کی صنعتوں کو صدمہ پہنچا۔ نئے نئے سامان نے ہماری ضروریات کو بھی بڑھایا، ان کی تیاری کے لئے بھی ہمارے ملک میں کوئی انتظام نہ ہو گا۔ اس کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری صنعت ختم

۱۲ یہ تقریر انگریزی حصہ میں ملاحظہ فرمائی جائے

ہو گئی۔ لیکن حکم بہت قناعت پسند واقع ہوئے ہیں اس لئے اس عظیم نقصان کو یہ کہہ کر برداشت کر لیا کہ ہمارا ملک ایک زراعتی ملک ہے ہم کو بس اسی کی طرف توجہ کرنی چاہیے ہم کھیتی میں لگے رہے لیکن اس کے بھی کامل استفادہ نہ کر سکے چنانچہ نہ تو ناقابل کاشت اراضی کے وسیع رقبوں کو زیر کاشت لاسکے اور نہ زیر کاشت اراضی سے اتنی پیداوار حاصل کر سکے جتنی کہ دوسرے ملکوں میں حاصل کی جاتی ہے اور نہ قیمتی اجناس کی کاشت کر سکے کیونکہ اس غرض کے لئے بھی صنعت میں تیار شدہ اشیاء کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے پھر چال بے شمار ضروریاتیں سے صرف ایک ضرورت کے لئے نامکمل سعی کرتے رہے اور اس کی آمدنی سے دوسری ضروریات کا سامان خرید کر خود کو غریب اور غیروں کو مالدار کرتے رہے۔ یہ صورت حال ایک صدی تک جاری رہی اور اب بھی بڑی حد تک قائم ہے۔

اس امر کا اندازہ کرنے کے لئے کہ ہم اپنی کتنی ضروریات خود پوری کرتے ہیں اور کتنی ضروریات کے لئے دوسرے ملکوں پر منحصر ہیں ان کو اپنے ملک کی درآمد اور برآمد پر غور کرنا چاہیئے۔

درآمد		برآمد	
کپڑا	دو کروڑ	روئی	۱ کروڑ
اجناس میوہ و ترکاری	۱۶ کروڑ	تیل	ایک کروڑ
دھاتی اشیاء	ایک کروڑ	تخمین تیل	۱۴ کروڑ
تیل سے تیار شدہ مال	ایک کروڑ	چمڑا	۱۴ لاکھ
سلک	۱۶ کروڑ		
ادویہ	۱۴ لاکھ		

ان میں سے اکثر اشیاء ایسی ہیں کہ خام حالت میں ہم درآمد کرتے ہیں اور تیار شدہ حالت میں کئی گنی زیادہ قیمت پر درآمد کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی اشیاء ایسی ہیں جو معدنیات کی شکل میں سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان سے کوئی استفادہ نہیں کیا جا رہا ہے یا جنگلوں میں نباتات کی شکل میں اگتی ہیں اور اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر مر جاتی ہیں اور ان کا بھی ہمارے پاس کوئی استعمال نہیں ہے۔

میں بعض خام اشیاء اور ان کے استعمال کا ذکر کر دینگا۔

کوئلہ۔ موجودہ صورت میں صرف بھاپ پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ہمارے

کوئلہ میں ۲۵ فیصد طیران پذیر مادہ موجود ہوتا ہے اسلئے یہ کوئلہ گیس، تار کول، نمبرز، امونیا اور خشک برف (ٹوس) کاربن ڈائی آکسائیڈ کی تیاری کے لئے نہایت موزوں ہے۔

دوم۔ مختلف قسم کی لوہے کی کچدھاتیں تمام ملک میں کہیں کم اور کہیں زیادہ مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ سب سے عمدہ قسم کا لوہا اور فولاد نظام آباد کے قریب تیار ہوتا تھا اور وینل کے بازاروں میں جا کر بچتا تھا۔ چنانچہ مشہور تلوار دمشق اسی فولاد سے تیار کیا جاتی تھی۔ اس صنعت کو پھر زندہ کرنے کے کافی امکانات ہیں۔ کچدھات کے بعض نمونوں کی میں نے تشریح کی ہے اور وہ بہار کی کچدھات سے زیادہ عمدہ پائی گئی۔ البتہ ایک وقت ایسے یہ ہے کہ ہمارا کوئلہ اس استعمال نہیں ہو سکتا یا تو بنگال سے کوئلہ منگنا ہوگا یا لکڑی کا کوئلہ استعمال کرنا پڑیگا۔ ایسے جھل جہاں کی لکڑی تعمیری اغراض کے لئے استعمال نہیں ہوتی ہے یا جہاں کی لکڑی اچھی قیمت پر فروخت نہیں کی جاسکتی اس کو جلا کر کوئلہ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کوئلہ لوہے کی صنعت میں استعمال ہو سکتا ہے۔ لوہے کی صنعت میں ہزاروں آدمیوں کو روزگار ملتا ہے اس لئے اس صنعت کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

ٹینکیز۔ اس کی کچدھاتیں بیدرا و نظام آباد میں پائی جاتی ہیں۔ یہ فولاد کی صنعت میں استعمال ہوتی ہے اسکی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جنگ کے زمانہ میں ناگپور کی ٹینکیز کی کانوں میں جو شخص بندیوں کا ٹھیکہ دار تھا وہ اتنا مالدار بنا کہ ناگپور یونیورسٹی کو نصف کروڑ سے زیادہ عطیہ دے سکا۔

ٹیاں۔ سرخ، زرد اور دیگر رنگوں کی ٹیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں ان سے مختلف قسم کے رنگ تیار کئے جاسکتے ہیں۔

نخم تیل۔ مونگ بلی، ارڈ، اسی، تل وغیرہ۔ ان سے مصنوعی گھی، تیل، صابن اور وین اور وائش وغیرہ تیار کئے جاسکتے ہیں۔

تانبا اور ایلومینیم۔ ان کی کچدھاتیں بھی بعض حصوں میں پائی جاتی ہیں ان سے باسانی تانبا اور ایلومینیم تیار کیا جاسکتا ہے

سیا۔ سیسے کی کچدھات گیلینا، منگنڈہ اور دیگر مقامات پر پائی جاتی ہے سیا نہایت قیمتی شے ہے اس سے سفیدہ وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں۔

چینی مٹی۔ ادگیر وغیرہ میں عمدہ قسم کی سفید چینی مٹی پائی جاتی ہے جس سے چینی کے برتن اور چینی کا

سامان تیار کیا جاسکتا ہے۔

ایرن پائرنیز۔ یہ شے گلبرگہ وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ اس سے سلفیورک ترشہ تیار کیا جاتا ہے جو ایک نہایت اہم تیزاب ہے اس سے دیگر بیشتر کیمیائی اشیاء تیار کی جاتی ہیں۔

گارکاپتھر۔ یہ کثیر مقدار میں خالص حالت میں پایا جاتا ہے اس سے شیشہ اور چوڑیاں تیار کی جاسکتی ہیں۔ محبوب نگر کے بعض علاقے قدیم زمانہ سے چوڑیوں کی تیاری کے لئے مشہور ہیں ان کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

ادویہ۔ ایسے بہت سے نباتات ہمارے جنگلوں میں اگتے ہیں جن سے مختلف ادویہ تیار

کیا جاسکتی ہیں۔

گلابوہ۔ سے الکحل۔ سیندھی سے ایسٹک ترشہ بھی تیار کیا جاسکتا ہے۔ اور بہت سی اشیاء ہیں جو اس ملک میں تیار کی جاسکتی ہیں مثلاً امونیم سلفیٹ، سوپر فاسفیٹ، آف لائیم، سوڈا، پتھری، مصنوعی ریشم وغیرہ۔

برقی قوت۔ اکثر صنعتوں کے لئے ارزاں برقی قوت کی ضرورت ہے اس لئے قدرتی ماخذوں سے برقی قوت حاصل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہم تقریباً ۴۸ کروڑ کا مال برآمد کرتے ہیں اور تقریباً اتنی ہی مالیت کا مال درآمد کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنی خام اشیاء سے استفادہ کریں تو بآسانی درآمد میں ۲ کروڑ کی کمی اور برآمد میں ۲ کروڑ کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ گویا ہر سال باہر سے ہمارے ملک میں ۶ کروڑ روپیہ آیا کر گیا جس سے ہمارے ملک کی خوشحالی میں معتد بہ اضافہ ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ باوجود ان ذخائر کے ہم نے صنعت میں ترقی کیوں نہیں کی۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ سرمایہ داروں نے کم تنخواہوں کے خیال سے نام نہاد کیمیا دانوں کو نوکر رکھا جس سے کام خراب ہوا۔ کارخانہ کے نگراں سائنس دان نہ تھے اس لئے وہ عملی دقتوں کو محسوس نہ کر سکے۔ تیسرے پرانے طریقوں سے مال تیار کرتے رہے اور ان کارخانوں کے ساتھ مابقت نہ کر سکے جو جدید تحقیقات کے نتائج سے استفادہ کر کے اپنے طریقوں کو بدلتے رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کچھ کارخانے شروع میں قائم بھی ہوئے تو وہ نقصان اٹھا کر بند ہو گئے۔ اور نئے کارخانے قائم کرنے کی دوسروں کو ہمت نہ ہوئی

اس کی ضرورت ہے کہ مختلف ماخذوں کی پیمائش کی جائے۔ ان سے استفادہ کا کام قابل ماہرین کے سپرد کیا جائے انتظامات تمام تر سائنس دانوں کے ہاتھوں میں ہوں اور تحقیقات کے ذریعہ مال پیدا کرنے کے طریقوں کو اڑاڑاں کیا جائے۔

اس تقریر کے ختم ہونے پر میرا کبر علی خان صاحب بی۔ اے ال۔ ال۔ بی آنرز بر سٹریٹ لائن جو تحریک پیش کی وہ یہ ہے۔

”اس کانفرنس کی رائے میں یہ امر مناسب ہے کہ کانفرنس کی جانب سے ممالک محدود سرکار عالی کے متفرقائے اضلاع و تعلقات میں عام مطالعہ خانے کھولے جائیں اس تجویز کو بروئے عمل لانے کے لئے صدر مجلس انتظامی مناسب اور ضروری کارروائی اختیار کرے“

محرک نے یہ تحریک پیش کرتے ہوئے مختصر طور سے بتایا کہ اس قسم کے کام کو آغاز کرنے کی عقدہ شدید ضرورت ہے ملک کے قدیم روایات اور ہماری تہذیب کے مشترکہ عناصر کی بقا و تحفظ کے لئے کتب خانہ اور مطالعہ گاہیں ہی مفید ثابت ہونگے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ام۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ پی۔ بیج۔ ڈی ڈی ایٹ نے اس تحریک کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ۔

جناب صدر !

اب تک جتنی تحریکیں ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ مجھے پی پسند ہے اور سب سے زیادہ دلی تائید میں اسی تحریک کی کر سکتا ہوں کیونکہ اب تک تقریباً ہر ایک تحریک میں حکومت سے کہا گیا تھا کہ فلاں کام کرے یا فلاں کام نہ کرے، کانفرنس نے خود اپنے کو کوئی ذمہ داری نہیں لی تھی فرمائش آساں ہے لیکن تعمیل میں بیسیوں دشواریاں ہوتی ہیں خوشی کی بات ہے کہ کانفرنس نے خود بھی کچھ کر نیا تہیہ کیا ہے جہاں وہ حقوق رکھتی اور انکی طلبگار ہے وہیں وہ کام کرنا چاہتی اور فرمائش اپنے دوش پر ہے۔

کتب خانوں کی ضرورت کسی توضیح کی محتاج نہیں۔ پڑھنے کے قابل بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ مگر ہر شخص کے بس میں نہیں ہوتا کہ ہر چیز خرید سکے۔ یوں بھی بعض چیزوں کا ہر شخص کی طرف سے خریدا

جانا شاید سراف میں داخل ہو جائے۔ مثلاً دشمن کے پرچار سے واقف رہنا ضروری ہے لیکن کثرت خریداری سے اسکی مالی سرپرستی قطعاً مناسب نہیں۔

ایک دوسرے پہلو یہ ہے کہ ہمیں ہمارے رہنما اور ہمارے معلم زندہ رہتے ہیں۔ ہمیں گوشت پوست کے آدمی کی ضرورت نہیں ہیں اس آدمی کی ضرورت ہے جو ہمیں کچھ کہتا ہو۔ گوشت و پوست کا ٹیگور زندہ ہے لیکن ہر اس خیر اور اس زبان میں ٹیگو پھینا مردہ ہے جہاں اس کی تائیس نہیں ہوں کہتے ہیں کہ اقبال مر چکے ہیں لیکن اصلی اقبال مرا نہیں وہ کروڑوں کی تعداد میں زندہ ہے۔ اگر اس سے ملنا اور مستفید ہونا چاہتے ہو تو کسی کتب خانے میں ہر وقت ملکتے ہو اور جتنی دیر چاہو ملکتے ہو۔ مزید ملاقاتیوں کی آمد خود اس کی مصروفیت حالات، کم فرنی وغیرہ ذرا بھی حائل نہ ہونگے۔

مجھے یقین ہے کہ اس مفید تحریک سے کئی کو اختلاف نہ ہوگا۔

یہ تحریک بالانفاق منظور ہوئی۔

اس نوبت پر آرموڈ و ایننگار صاحب ایڈوکیٹ نے ”قانونی تعلیم کے چند پہلو“ پر انگریزی میں ایک مقالہ پڑھا اس کے اختتام پر ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی ام اے پی ایچ ڈی سائنس کی تعلیم کے عنوان سے جو مقالہ سنایا وہ درج ذیل ہے۔

سائنس کی تعلیم

اس مختصر مضمون میں کوشش کجائیگی کہ سائنس کی جو تعلیم ہندوستان میں دی جاتی ہے اس پر تنقید نظر ڈال کر معلوم کیا جائے کہ اس تعلیم میں کیا نقائص ہیں اور انہیں کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔

اکثر علوم اور خصوصاً سائنس میں ترقی گذشتہ ایک سو سال کے دوران میں ہوئی ہے اس کے تفصیلی ذکر کی آج ضرورت نہیں اس امر سے ہر تعلیم یافتہ شخص کم و بیش واقف ہے کہ علوم و فنون کے عمارتوں کی جو بنیادیں بابلی، مصری، چینی، ہندوستانی اور عرب قوموں نے ڈالیں تھیں وہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی چلی گئیں۔ اور اب آسمان سے باتیں کر رہی ہیں لیکن اس سے بہت کم لوگوں کو واقفیت ہے کہ انہی سر بفلک عمارتوں کی بنیادیں اس قدر کمزور تھیں کہ اگر بروقت ان کو مستحکم نہ کیا جاتا تو شاید اب ان عمارتوں سے یہ مقالہ حصہ انگریزی میں ملاحظہ ہو۔

کائنات بھی نظر نہ آتا۔ سائنس کی بنیادوں کے متعلق اس تحقیق و تجسس کا نتیجہ ہے کہ ان کے بنیادی اصولوں میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا ہے جو نتیجے پہلے بدیہی تھے اب ان کے ثبوت کی تلاش ہے جو تعریفیں پہلے کافی سمجھی جاتی تھیں اب وہ مہمل قرار دی جاتی ہیں۔ جو مسئلے کسی زمانہ میں انتہائی اہمیت رکھتے تھے وہ اب کہیں گوشہ گنہامی میں پڑے ہیں۔ ریاضیات میں کبھی ضابطوں اور ان کے استعمال پر زور دیا جاتا تھا اب ان کو یاد رکھنے کی کوئی فکر نہیں کرتا بلکہ طریقہ استدلال پر توجہ مرکوز رہتی ہے۔ طبیعیات میں پہلے ”خواص مادہ“ کے مضمون کی بہت اہمیت تھی اور اب جوہری طبیعیات کا موضوع اہم ترین سمجھا جاتا ہے علم کیسا کام کر سکتا غیر نامیاتی کیا ہے ہٹ کر نامیاتی اور طبیعی کیا کی طرف آ گیا ہے۔ باقی دوسرے علوم کا بھی یہی حال ہے ان واقعات کی روشنی میں آپ ہماری درس گاہوں کو ملاحظہ فرمائے۔ اکثر طلبہ کو مدرسہ اور کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی اپنے مضمون کے بنیادی اصولوں سے کماحقہ واقفیت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ خود نفس مضمون کے متعلق ان کی معلومات وہیں ختم ہو جاتی ہیں جہاں سے بنیاد شروع ہوتا ہے گزشتہ سو سال کے دوران میں جو زنی ہوئی ہے اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے اور انہوں نے کبھی کسی عام فہم کتاب کو پڑھا ہے کوئی بلکہ بکھر سنا ہے تو زیادہ سے زیادہ چند نئے ناموں سے واقف ہو جاتے ہیں اور انہی اصطلاحوں کے بل بوتہ پر اپنے دوست احباب پر رعب جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان نئے اصطلاحوں کی تشریح اور ثبوت سے قطع نظر اگر ان کی تعریف ہی پوچھئے تو وہ صحیح طور پر نہیں بیان کر سکتے۔ مثلاً آج کل آب اکثر اصحاب کی زبان پر ناقلہ میڈیسی ہندسہ، چار ابعاد جوہری مرکزہ اور اسی قسم کے میسوں الفاظ پائینگے حالانکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کتنے حضرات ان الفاظ کے حقیقی معنوں سے بھی واقف ہیں۔

اس جہالت اور نادان قہمی کا ذمہ دار ہم ان بیچارے طالب علموں کو نہیں ٹھیرا سکتے جو ہندوستانی نظام تعلیم کے مشق ستم ہیں۔ زمانہ تعلیم کا اکثر و بیشتر حصہ کہنہ اور متروک معلومات کے بہم پہنچانے میں صرف کر دیا جاتا ہے اور جدید ترین معلومات تک پہنچنے کی کبھی نوبت نہیں آتی۔ اس کے دو بڑے وجوہات ہیں جو شاید ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ اول تو نصاب تعلیم میں ہی یہ تحدید کر دی جاتی ہے کہ کسی مضمون کے متعلق فلاں چیزیں پڑھائی جائیں گی اور انہی پر امتحان لیا جائے گا۔ نصاب بنانے والے اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جدید ترین معلومات بھی ان میں شامل کر دی جائیں تو وقت کافی نہیں ہو گا اور پھر ایسے پڑھانے والے بھی نہیں ملینگے جو مددوں اور کالج کی مختلف منزلوں پر ان جدید معلومات سے بخوبی واقف ہوں۔

دوسری طرف پڑھانے اور پڑھنے والوں کو یہ فکر رہتی ہے کہ مقررہ نصاب کسی طرح ختم ہو جائے اور امتحان کے وقت زیادہ سے زیادہ تعداد میں طلبہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں۔ اس لئے نہ تو طالب علم ہی کی خواہش ہوتی ہے کہ نصاب کے باہر جدید معلومات حاصل کرے اور نہ استاد ہی انہیں ایسی ترغیب دلاتے ہیں۔ بلکہ بعض وقت تو یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر اتفاق سے کسی طالب علم میں بلند پروازی کا رجحان ہو تو استاد اسکو پکڑ کر پھر اس کی ترقی نفس میں بٹھا دیتے ہیں۔ اب چونکہ انہی امتحانوں کے فارغ التحصیل طلبہ لگے چل کر مدرس یا پھر ادارہ ہوتے ہیں اس لئے ان میں نئی معلومات ہفت روزہ ہوتی ہیں اور اس فقدان کی شکایت نصاب تعلیم بنانے والے حضرات کیا کرتے ہیں۔ غرض کہ علت معلول کا یہ دہرہ پورا ہو جاتا ہے اور یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ چلو جائیں علت قرار دیں اور جس کو چاہیں معلول۔

سائنس کی تعلیم میں اس نقص کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ نہ صرف قیمتی وقت بلکہ اس سے زیادہ قیمتی دماغ شکل اور پیچیدہ مشقوں اور سوالوں کے حل کرنے میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے یہ رجحان دوسرے علوم کی نسبت علم ریاضی میں بہت زیادہ ہے، اور انگلستان کے مدرسوں اور کالجوں سے ہندوستان میں داخل ہوا ہے۔ بر اعظم یورپ کے دوسرے ملکوں اور امریکہ میں یہ رجحان بہت کم ہے اسکا متعلق کوئی طویل بحث کرنے کی بجائے میں صرف ایک ذاتی واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کروں گا جو شاید اس بحث سے زیادہ موثر ثابت ہو۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضیات کا ڈگری پاس ختم کرنے کے بعد میں لائپزگ یونیورسٹی میں تحقیقاتی کام کے سلسلہ میں ٹھہرا ہوا تھا یہاں پروفیسر ٹائی زن برگ کی وجہ سے طبیعیات کا ڈیپارٹمنٹ بہت مہموزہ تھا اور بہت سے مالک سپروفیسر وغیرہ آئے ہوئے تھے ایک مرتبہ جبکہ سمینار کے سلسلہ میں سب لوگ جمع تھے امریکہ کے ایک پروفیسر نے مجھ سے تذکرہ دریافت کیا کہ میں نے اس سے قبل کیا تعلیم پائی ہے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں کیمبرج سے ریاضیات کا ڈگری پاس ختم کر کے آیا ہوں تو انہوں نے بہت حیرت سے دریافت کیا کہ ”کیا آپ واقعی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ڈگری پاس کے سوالوں کو حل کرنے کے بعد بھی آپ کا دماغ صحیح و سالم ہے؟“

حاصل یہ کہ سائنس کی تعلیم میں جو وقت بے فائدہ مشقوں اور سوالات کی تعلیم میں صرف کیا جاتا ہے اس کو بنیادی اصولوں کی تشریح ان کا ایک دوسرے سے تعلق، جدید سائنس میں ان کی اہمیت وغیرہ کی توضیح میں لگایا جائے تو مفید نتائج پیدا ہونگے اور طلبہ میں خود غور و فکر کی عادت پیدا ہوگی۔ یہ نہیں کہ سوالات کو چند قاعدوں کی مدد سے میکانیکی طور پر حل کر دیں اور ان میں یہ احساس بھی نہ ہو کہ کوئی جوابی نتیجہ

اہل یا مضحکہ خیز تو نہیں ہے۔ حال ہی کا واقعہ ہے کہ اٹنی اسکول یونگ ٹریفک کے امتحان میں میں نے ایک سوال دیا تھا کہ اگر ایک سوڑ کی قیمت بمبئی میں ساڑھے تین ہزار کھدار اور ریلوے کا کرایہ ۱۵۰ روپیہ کھدار اور جیڈ آباد میں ۵ روپیہ فی صدی کے حساب سے کروڑ گیری ادا کرنی پڑے اور یہاں کا بجٹ ۲۰ فیصد نفع لیکر فروخت کرے تو خریدار کو سکہ عثمانیہ میں کیا قیمت ادا کرنی پڑیگی۔ جب کہ نرخ تبادلہ ۱۰۰ روپیہ کھدار کے لئے ۱۱۵ روپیہ ہمار سکہ عثمانیہ ہو۔

اس سوال کے جواب میں بعض امیدواروں نے لاکھوں روپیہ قیمت نکالی اور ایک برخوردار نے تو غضب کر دیا کہ دو کروڑ سے زیادہ روپیہ جواب میں حاصل کئے۔ آپ خود اندازہ فرمائیے کہ میٹرک کے طالب علم کو اسکا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ایسا جواب مہل ہے اور وہ جواب کو برقرار رکھتا ہے۔

میں نے طالب علمی کے زمانہ میں کسی فارسی کتاب میں ایک مقولہ پڑھا تھا کہ اگر کسی وعظ کا اثر سامعین پر نہ ہو تو یہ سامعین کا تصور نہیں بلکہ اعظ کا قصور سمجھو کہ اس نے مضمون کو اس طرح نہیں بیان کیا جو دل نشیں ہو۔ میری دانت میں یہ مقولہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ اور طلبہ اور عوام الناس میں سائنس اور ریاضی کی طرف سے جو دہشت و میٹھی ہوئی ہے اس کے ذمہ دار صرف سائنس دان ہیں جو مضمون کو اس قدر خشک اور غیر دلچسپ بناتے ہیں کہ طالب علم کو خواہ مخواہ ایک قسم کی سنا فرت پیدا ہوتی ہے۔ ہیں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ سائنس اور ریاضی کے ادق سے ادق مسائل کو بھی دلچسپ بنانا ممکن ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے خود استاد کو بھی کافی مہارت ہونی چاہیے ہندوستان کے ابتدائی مدارس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ابتدائی جماعتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرس نہیں مہیا کئے جاتے حالانکہ تعلیم کی یہی وہ منزل ہے جو بچے زیادہ کمشن ہے۔ میری رائے میں کوئی مدرس چاہے وہ جماعت صغیر یا اول کو پڑھاتا ہو بی اے ٹرینڈ سے کم نہیں ہونا چاہیے ڈل اور میٹرک کے مدرسین کم از کم ایم۔ اے اور ایم۔ اے سی ہونے چاہئیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں آپ اس شرط کو نکال دے سکتے ہیں۔ لیکن معلم کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا لازمی ہے کبھی مضمون کو وہی شخص آسان بنا سکتا ہے یا دلچسپ طریقہ سے سمجھا سکتا ہے جو اس کے ہر پہلو پر پوری طرح حاوی ہو۔ اگر آپ ایک میاٹرک کا مباحثہ شخص کو پڑھانے بٹھائیں تو ظاہر ہے کہ وہ سوائے اس کے کہ کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کو دہرا دے اور کیا کر سکتا ہے مجھے یہ معلوم کر کے سخت فحس ہوا کہ ایک ایسے مدرس میں جو یوڈون اداروں کی نگرانی میں ہے اور جہاں طلباء سے تقریباً ۱۵ روپیہ ماہانہ فیس لیجانی ہے بعض ایسے استاد سنیر

یکیرج کی جامعیت کو پڑھاتے ہیں جو خود بھی صرف منیر کجبرج کا سیلاب ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جو تخواہیں اس وقت ابتدائی جامعیت کے مدرسین کو درجائی ہیں ان تخواہوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرس نہیں مل سکتے تو کلفنڈ کے بعض مدارس کے متعلق مجھے ذاتی علم ہے کہ استادوں کی تخواہیں پندرہ بیس روپیوں سے زیادہ نہیں جو دوسرے ملکوں میں چار سو کوٹتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ معقول شاہرہ ویکو اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرسین کو ابتدائی مدارس میں بھیجا جائے جیسا کہ یورپ اور امریکہ میں ہوتا ہے تاکہ ہندوستان کے طلباء کی بنیادی تعلیم بھی ان غیر مالک کے طلبہ کی طرح مستحکم ہو سکے تعلیم ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو کسی قوم کو بناتا ہے اور اس کے لئے کسی ملک کو بحث میں عدم گنجائش کا عذر نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے شعبوں کی گنجائش سے اس کمی کو بہر حال پورا کرنا ضروری ہے

اب تعلیم کے مضامین پر غور کیجئے تو جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے اعلیٰ تعلیم کے ختم ہونے پر بھی جدید معلومات تک پہنچنے کی نوبت نہیں آتی۔

غالباً ارباب تعلیم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ تعلیم کی اس قلیل مدت میں جو ایم۔ اے کامیاب کرنے پر مشتمل ہوتی ہے کسی سائنس کے جدید ترین اصول نہیں بتلائے جاسکتے۔ لیکن ایک تو فرانس، جرمنی، امریکہ کے نظام تعلیم سے اس کے خلاف ثبوت فراہم کیا جاسکتا ہے دوسرے خود ہریونیورسٹی میں غور کیا جاسکتا ہے کہ میٹرکولیشن سے لیکر ایم۔ اے تک لینے ۹ سال کے دوران میں کیا کچھ نہیں بتایا جاسکتا بشرطیکہ بہت سے فرسودہ مضامین اور لائسنسی تفصیلات کو چھوڑ دیا جائے اور بے فائدہ مشقوں اور سوالوں میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ علوم ریاضی اور طبیعیات کے لئے جن سے مجھے تھوڑی بہت واقفیت ہے میں نے چند دنوں قبل تفصیلی نصاب بنا کر بنلایا تھا کہ ۹ سال میں ان علوم کے جدید ترین اصول بتائے جاسکتے ہیں اور ہر طالب علم کے لئے چھوڑ دیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے رجحان اور مذاق کے مطابق ان میں سے کسی ایک شاخ کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کرے۔ یہ نہیں کہ ریاضیات کے ایک ایم۔ اے کامیاب طالب علم کو تفرق اور تکل کی وہی تعریفیں معلوم ہوں جو ڈھائی سو سال قبل نیوٹن اور لائبنٹزن نے کی تھیں اور یہ معلوم ہی نہ ہو کہ جدید ریاضی میں ان میں کہاں مکمل انقلاب ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے مائینوں سے واقفیت رکھنے والے حضرات اپنے اپنے سائنس کے متعلق اسی قسم کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔

اس طرح وقت ضائع کرنے کی بجائے جدید تحقیقات کے بنیادی اصول طالب علم کے سامنے

تعلیم ختم کرنے سے قبل ہی پیش کر دئے جائیں تو وہ نسبتاً کم عمر میں اپنے مضمون کے انتہائی مداح سے واقف ہو کر اس عمر میں جبکہ انسان کا دماغ پوری قوت کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اپنی اپنی تحقیقات میں مصروف ہو جائینگے جدید سائنس کی تاریخ شاہد ہے کہ تقریباً تمام بڑے انکشافات اور اہم ترین ایجادات ابتدائی عمر میں ہی ہوتے ہیں اور تحقیقاتی کام کرنے کا بہترین زمانہ جوانی کا ہے۔ پروفیسر آئن سٹائن نے نظریہ اضافیت کا انکشاف ۲۶ برس کی عمر میں کیا تھا۔ پروفیسر بوہر نے *Quantum Theory* کا انکشاف ۲۸ برس کی عمر میں اور پروفیسر مائی زن برگ نے *Quantum Mechanics* کا انکشاف ۲۵ برس کی عمر میں کیا۔ پروفیسر *De Broglie* کی عمر اپنے اہم ترین انکشاف کے وقت ۳۱ برس۔ پروفیسر *Schrodinger* کی عمر ۳۹ برس اور پروفیسر *Einstein* کی عمر ۲۴ برس تھی۔ یہ سب علما اپنے مضمون کے ماہر اور نوبل انعام یافتہ ہیں۔ ان کے علاوہ گزشتہ چند سال کے دو سربے نوبل انعام یافتہ مثلاً *C.P. Thomson* *Anderson* *Merz* وغیرہ بھی مقابلہ کم عمر ہیں۔ یہ اسی نظام تعلیم کا نتیجہ ہے کہ جامعہ سے فارغ التحصیل ہونے سے قبل طالب علم اپنے مضمون کے جدید ترین تحقیقات سے نہ صرف واقف ہوتے ہیں بلکہ خود بھی اسی باہر کی تحقیقات کر سکتے ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہماری جامعات کے میٹرک سے لیکر ایم۔ اے تک تمام نصابوں کو بنیادی طور پر بدل دیا جائے۔ یوں تو ہر چند سال کے بعد کسی قدر تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے لیکن فرسودہ مضمون کی بجائے وہ سب فرسودہ مضمون کو رکھنے سے کوئی اصولی فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔ اب محض رد و بدل کا زمانہ نہیں بلکہ ایک انقلاب کی ضرورت ہے کہ پورا نصاب تعلیم مکمل طور پر بدل دیا جائے۔ اسی ضمن میں ایک غلط فہمی کو بھی رفع کر دینا ضروری ہے جو ہماری قومی زندگی پر نہایت بدنامہ وجہ ہے ایک خاص طبقہ میں آج کل جامعہ عثمانیہ کی تعلیم اور یہاں کے تعلیم یافتہ طلباء کی مذمت کرنا فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ ہم ان لوگوں کو سامنے علی الاعلان کہتے ہیں کہ بیشک ہماری تعلیم میں نقائص ہیں اور ایسے نقائص ہیں جو ان کے دہم و گمان میں بھی نہیں لیکن یہ نقائص صرف جامعہ عثمانیہ سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے ہندوستان اور انگلستان کی تمام یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں۔ گزشتہ سات سال کے عرصہ سے میں کلکتہ، مدراس، الہ آباد، پنجاب وغیرہ دوری یونیورسٹیوں کا مسلسل مہتمن رہا ہوں اور ڈاکٹر آف سائنس سے لیکر ایم بی سی اور بی اے آرزو تک تمام ڈگریوں کے لئے امتحان لیتا ہوں۔ میں ہمارے ان کرم فرما ناقدین کو یقین

دلانا چاہتا ہوں کہ وہ ان بیرونی جامعات کے مقابلہ میں جامعہ عثمانیہ میں کوئی غیر معمولی نقص نہیں پائینگے۔ جو کچھ بھی نقص ہیں وہ موجودہ نظام تعلیم اور نظام امتحان کے ساتھ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

اس نظام تعلیم کا ایک اور نقص یہ ہے کہ مہم افادیت کے خیال سے تعلیم کے اصلی مقصد کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ستم ظریفی یہ کہ اس قربانی کے باوجود حقیقی افادیت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کی تشریح کے لئے یہاں صرف میٹرکولیشن کے علم ہندسہ کی تعلیم پر روشنی ڈالی جائے گی۔ میٹرک کے لازمی ریاضی کے نصاب میں عملی ہندسہ رکھا گیا ہے جس میں مختلف شکلوں کا بنانا سکھایا جاتا ہے اور ان عملوں کے ثبوت کے متعلق کچھ نہیں کہا جاتا۔ ان مسئلوں پر غور کیجئے تو ان میں سادہ ترین مسئلوں جیسے ایک خط کے دو مساوی حصے کرنے کے مسئلہ کے علاوہ پیچیدہ ترین مسئلے بھی شامل ہیں اب ہر سمجھدار شخص یہ دریافت کر سکتا ہے کہ اگر افادیت ہی کسی مضمون کے بڑھانے یا جھوڑ دینے کا سیار ہو تو ان عملی سکولوں کا طالب علم کو آئندہ زندگی میں کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ۹۰ فیصدی میٹرک کا مباحثہ طلبہ کو یہ کب ضرورت پڑتی ہے کہ ایک یا دو دائرہ بنائیں جو ایک دوسرے ہوئے نقطہ میں سے گزرے اور دو کے ہوئے نقطوں کو مس کرے؟ افادیت کا تو یوں خاتمہ ہو چکا۔ دوسری طرف آپ طالب علم کی مشکلات پر غور فرمائیے۔ ثبوت یا طریقہ استدلال سے تو وہ بالکل واقف نہیں ہوتا کہ ان کی بنیاد پر عمل کو خود نکال سکے اس لئے اس کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ طریقہ عمل کو زبانی یاد کر لے اور امتحان میں بھنسنے لگے۔ اسی سوال پر کہ باضیات کے ابتدائی اصول سے واقفیت طلبہ کے ذہن و قوت استدلال کی تربیت کے لئے اور ان کو ایک مفید ٹھہری بنانے کے لئے ضروری ہے یا نہیں۔ ارباب قنڈار اور ارباب تعلیم ایک تہہ کال غور و خوض کے بعد تصفیہ کر لیں اور اگر بڑھانا ہی ضروری سمجھا جائے تو پھر ان علوم کو اسی طریقہ سے بڑھانا چاہیے جو ان کے لئے ناگزیر ہے۔ علم ہندسہ کو بغیر ثبوت اور استدلال کے بڑھانا قطعی اہل ہے اور استدلال میٹرک کے طلبہ کی طاقت سے باہر رہی نہیں۔ اگر وقت کے ناکافی ہونے کا سوال ہے تو زیادہ حصہ پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ چند مسئلوں پر اکتفا کیا جاسکتا ہے۔ کالج کی تعلیم میں بھی بعض وقت اہم مسئلوں کے ثبوت غیر تشبیہی بحث طرز پر دئے جاتے ہیں۔ اور بنیادی مفہوم اور اصول جن پر سارے مضمون کا دار و مدار ہوتا ہے اسی طرح پر نہیں سمجھائے جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ ضابطوں کی مدد سے پیچیدہ سوال تو حل کر لیتے ہیں۔ لیکن خود نفس مضمون کو واضح طور پر نہیں بیان کر سکتے۔ گذشتہ ہفتہ ہی کا واقعہ ہے کہ بیرونی یونیورسٹی کے ایم بی سی۔ امتحان کے پڑھوں کو جانچتے وقت مجھے اس قسم کی افسوس ناک مثالوں سے سابقہ پڑا تھا۔

ہامری یونیورسٹیوں میں یہ بھی عیب ہے کہ اعلیٰ جماعتوں میں طریقہ تعلیم تقریباً اسی قسم کا ہے جو مدرسوں میں رائج ہے حالانکہ اس منزل پر کتابی تعلیم کی بہ نسبت خود طلباء کے پجروں اور مباحثوں کو زیادہ اہمیت دیجانی چاہیے۔ یہ طریقہ سیمینار اور *Seminar* کے نام سے مشہور ہے اور جرمنی اور سرائس میں اس کا بہت رواج ہے۔ اس سے ایک طرف طلبہ کو جدید تحقیقات سے واقفیت اور مہارت ہوتی ہے تو دوسری طرف ان میں خود تحقیق و تجسس کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یوں بھی مالی حال تک ہمارے پاس یونیورسٹی کا مقصد اویں ہی سمجھا جاتا تھا کہ طلبہ کو نصابی تعلیم دے کر امتحان پاس کرایا جائے اور پھر ڈگریاں عطا کی جائیں۔ تحقیقاتی کام کا اگر کہیں کچھ انتظام تھا بھی تو اس کی اہمیت دوسرے درجہ پر تھی۔ شکر ہے کہ اب اس طرف بھی قدم اٹھنے لگا ہے اگرچہ اب بھی اسکی حقیقی اہمیت کے موافق اسکا انتظام نہیں ہوتا۔ چنانچہ اب بھی اکثر یونیورسٹیوں میں کتب خانے اور جریدہ خانے سائنٹفک طور پر منظم نہیں ہیں۔ تحقیقاتی رسالوں اور کتابوں کے منگوانے کی بہ نسبت درسی کتابوں ترجیح دیجاتی ہے مثلاً ریاضی اور طبیعیات کے رسالوں ہی کو لیجئے۔ ان علوم کے زیادہ نہیں تو کم از کم پاس بہترین رسلے دنیا کے مختلف مقاموں سے نکلتے ہیں۔ ہندوستان کے شاذ و نادر ہی کتب خانے ایسے ہونگے جہاں آٹھ دس سے زیادہ رسلے موجود ہوں۔ بعض جگہ پیسوں کی کمی کا عذر ہے تو بعض جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے رسلے بہت کم لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ جو لوگ پیسے نہ ہونے کا عذر پیش کرتے ہیں وہ دوسری ناماشی چیزوں کے لئے دل کھول کر خرچ کرتے ہیں اور جو دوسری زبانوں سے ناواقف ہیں کا عذر کرتے ہیں وہ خود انگریزی رسالوں اور کتابوں کی طرف بھی کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ آئندہ نسلوں کے لئے مواد کی عدم موجودگی کی وجہ سے تحقیقاتی کام میں کس قدر دشواریاں پیش آئیں گی۔

پھر انہی مقاموں پر جو فنڈ کی نام نہاد کمی کے باعث اہم رسلے یا کتابیں فراہم نہیں کر سکتے بعض دوسری کتابوں اور رسالوں کی اس قدر افراط ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا آخر اس کا کیا مصرف ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک رسالہ ”یومر“ ہی کو لیجئے۔ یہ انگریزی کا ایک مشہور رسالہ ہے جو لندن سے ہر ہفتہ نکلتا ہے اور یوں سمجھئے کہ سائنٹفک نیور اینجینی کا کام دیتا ہے یعنی چونکہ دوسرے رسالے ماننا یا سرمایہ شائع ہوتے ہیں اور ان میں طویل تصنیفی مضامین کے پچھنے کے لئے عرصہ لگتا ہے اس لئے محض ان انکشافات کا اعلان مختصر طور پر پچھ میں کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے بعض کتابوں کے نمبرے اور سائنٹفک مجلسوں کی روئداد بھی شائع ہوتی ہے۔

کسی محقق کے لئے اس رسالہ کو ایک آدھ گھنٹہ سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں لیکن ہندوستان میں اکثر مقاموں پر صرف یونیورسٹی کے حدود کے اندر کم از کم نصف درجن کاپیاں اس رسالہ کی آتی ہیں جبکہ چند تقریباً اگنی دینا پڑتا ہے حالانکہ صرف ایک کاپی بھی ساری یونیورسٹی کے ضروریات کے لئے کافی ہے اس کی بہت سے دوسرے رسالے منگوائے جاسکتے ہیں جو بدرجہا اہم ہیں۔ اس ایک رسالہ کا ذکر صرف تمثیلاً کیا گیا ہے ایسی بہت سی دوسری مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے درمیان اشتراک عمل نہیں ہوتا اور ہر شعبہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنانا چاہتا ہے پھر ہوگا کہ تمام مشترکہ دھرمیوں کے رسالے اور کتابیں یونیورسٹی یا خود شہر کے مرکزی کتب خانہ میں منگوائی جائیں۔ اس میں نمبر، فلاسفیکل سیکرٹری، رائل سوسائٹی کے پریسیڈنگ اور میرٹس اکاڈمی کے پریسیڈنگ وغیرہ شامل رہیں۔ جو رسالے خاص موضوع پر ہوں وہ اس شعبہ کے کتب خانہ میں منگوائے جائیں اور ہر اہم رسالہ ضرور منگوا یا جائے۔ چاہے اس کی وجہ سے فرنیچر کی مدین یا انتظامی مصارف میں بابا لاخر اساتذہ کی تنخواہوں میں کمی کیوں نہ کرنی پڑے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ رسالے صرف الماریوں کی زینت ہی نہ رہیں بلکہ حتی الامکان ان کا استعمال کیا جائے اس کے لئے اول تو خود اساتذہ کو ان سے واقف ہونا چاہئے پھر وہ طلبہ کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہر فرد کے لئے اس کا موقع نہیں ہے کہ ہر ایک تحقیقی مضمون کو تفصیل سے پڑھ کر سمجھ سکے اس لئے مناسب ہوگا کہ اپنے اپنے مذاق اور دلچسپی کے مطابق ہر استاد ایک مضمون کا انتخاب کرے اور حال میں اس مضمون کے متعلق مختلف رسالوں میں جو تحقیقی مقالے شائع ہوئے ہیں ان کا خلاصہ سمیٹنا زمین بیان کرے۔ اسی ضمن میں چند مضمون اعلیٰ جماعتوں کے طلباء کے پڑھائے جاسکتے ہیں۔ تاکہ وہ ان کے متعلق مواد فراہم کریں اور اچھی طرح مہارت حاصل کرنے کے بعد ہینڈا میں بکچر دیں۔ اس طریقہ سے طلبہ کے معلومات اور بکچر میں بہت اضافہ ہوگا اور تحقیقی کام کی طرف بے حد ترغیب ہوگی۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان *Unigulation System*

راج کیا جائے یعنی اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ چند مہینوں میں بیرونی جامعات میں دوسرے اساتذہ کی زیر نگرانی کام کر سکیں۔ اس سے ان کو نہ صرف مختلف ماہرین کے معلومات سے مستفید ہونے کا موقع ملے بلکہ تعلیم کے متعلق مختلف خبریوں سے بھی واقفیت ہو جائیگی۔ جرمنی میں یہ طریقہ عام طور پر رائج ہے اور طلبہ کے خیالات کی وسعت اور بنگلی میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

لیکن ہر طالب علم کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے وطن کے علاوہ مختلف مقاموں میں تحصیل علم

کر سکے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مختلف جامعات آپس میں یہ انتظام کریں کہ ایک جگہ کے اساتذہ وقتاً فوقتاً دور
جائیں ایک یا دو مقامات تک پھر دیتے رہیں۔ اس سے اساتذہ اور طلبہ دونوں کو بے حد فائدہ ہوگا۔ اگر یہ انتظام
اس طریقہ پر کیا جائے کہ مثلاً مدراس کے ایک پروفیسر کلکتہ جائے اور کلکتہ سے ایک پروفیسر مدراس لے
تو میرے خیال میں زیادہ انتظامی وقتیں بھی نہیں ہوں گی۔ اور اگر ایسی وقتیں ہوں بھی تو انہیں کسی نہ کسی طرح
حل کرنے چاہیے۔ بعض مشکلات کے خوف سے کسی اہم اسکیم کو پس پشت ڈال دینا تدبر کی علامت نہیں ہے
حضرات! اس مختصر مضمون میں سائنس کی تعلیم کے متعلق چند خیالات نمونہ آپ کی خدمت
میں پیش کئے گئے ہیں جو کم و بیش دوسرے علوم کے متعلق بھی اسی طرح صحیح ہیں۔ آج کل نہ صرف ہماری
ریاست میں بلکہ کل ہندوستان میں تعلیم کی تنظیم جدید پر غور ہو رہا ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ مختلف
پہلوؤں سے اس مسئلہ پر بحث کی جائے۔

بہت سی اہم باتیں وقت کی تنگی کے سبب یہاں چھوٹ گئی ہیں جو کسی آئندہ موقع پر تفصیلی معلومات
کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔

یہ مقالہ ختم ہو جانے پر نواب مہدی یار جنگ بہادر صدرالہمام ساریات و تعلیمات نے سرشار تعلیمات
کے آئندہ نظام العمل پر تقریر فرمائی اور اس سلسلہ میں بیان کیا کہ۔

مجھے یہ بتانا ہے کہ ہم کیا کرینگے اور کیا نہ کرینگے گویا ہمارے لگوں کیا ممکن اسلئے ہے۔ تقریر کا سلسلہ جاری
رکتے ہوئے نواب صاحب نے کہا کہ حکومت کا اولین فرض ہے کہ وہ رعایا کو تعلیم دے۔ لیکن یہ ایک
ہی اسکا فرض نہیں ہے بلکہ اور دوسرے بھی فرائض ہیں ان فرائض پر غور کرنے اور آمدنی پر غور کرنے کے بعد
اس کا موازنہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا میدان عمل نہایت محدود ہو گیا ہے تعلیم کو ایک مثلث زاویہ سے تشبیہ
دی جاسکتی ہے جبکی بنیاد ابتدائی تعلیم، درمیانی حصہ ثانوی تعلیم اور چوٹی جامعہ کی تعلیم ہے ابتدائی تعلیم پر زیادہ روپیہ
صرف کر کے اور اس کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے سے اس کا فائدہ تمام ملک کو پہنچ سکتا ہے۔ ہمارا سب سے
پہلا کام موجودہ موازنہ کو اس طرح استعمال کرنا ہے کہ اسکا اکثر و بیشتر حصہ ابتدائی تعلیم پر صرف ہو یا فی رقم ثانوی
تعلیم پر صرف ہو سکے۔ آج کل پورے ہندوستان میں ابتدائی تعلیم زور دیا جا رہا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ
ثانوی تعلیم پر بھی۔ اسکے بعد نواب صاحب نے کہا کہ ہمارے اس پاس کی حکومتیں اس پر توجہ کر رہی ہیں کہ
ابتدائی تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ روپیہ کس طرح فراہم کیا جائے۔ اس کے لئے یہ صورت

نکالی ہے کہ خود مدارس میں کسی نہ کسی پیشہ یا صنعت کا اضافہ مناسب ہو گا مگر ہمارے نزدیک یہ اسکیم ممکن نہیں اس وجہ سے نہیں ہے کہ لڑکے کا زیادہ وقت اگر کم کرنے کی دمن میں صرف ہو تو وہ تعلیم کس طرح حاصل کرے گا۔ اس کے بعد نواب صاحب نے ایک مدت کا تعین کیا جس میں لڑکے کا سیلان اور اس کا رجحان معلوم کیا جائے کہ وہ اس مدت میں کس طرف راغب ہے، اس کے بعد اس کو کسی پیشہ کی طرف یا تعلیم ہی کی جانب رجوع کر سکتے ہیں دوران تقریریں نواب صاحب نے نوانی تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نوانی تعلیم معلما کی فراہمی پر منحصر ہے ہمارے ہاں اچھی عظمت نہیں ملتی اب تک تعلیمات کو جو کچھ بھی ملی ہیں وہ پرائمری اسکول کی ٹریننگ پائی ہوئی ہوتی ہیں۔ جو سررشتہ کے لئے ناکافی ہے اور جو مل رہی ہیں وہ موصوعات اور اضلاع پر جانے انکار کرتی ہیں اور مضر ہوتی ہیں ان کو ان کے شوہری کے مستقر پر رکھا جائے اس لئے یہ امر بھی نوانی تعلیم کی ترقی میں ایک رکاوٹ ثابت ہو رہا ہے۔

بہر حال سررشتہ تعلیمات اس سے جو بگڑ چکی ہو کوشش کر رہا ہے اور توقع ہے کہ اسکی کوشش کامیاب ثابت ہوگی۔

نواب صاحب کی تقریر کے بعد جناب صدر صاحب کانفرنس نے اپنی جانب سے تحریک مندرجہ ذیل پیش کی۔

”یہ کانفرنس اپنے سابقہ تحریکات کے متعلق جلد تر کارروائی کی تکمیل کے لئے سررشتہ جات متعلقہ کی توجہ مبذول کرائی“

یہ تحریک بالاتفاق منظور ہوئی جبکہ بعد صاحب زادہ، میر محمد علی خاں صاحب سیکشن نے ایک نظم سنائی۔ اسکے ختم ہونے پر صدر صاحب کانفرنس نے اختتامی تقریر فرماتے ہوئے کانفرنس کی کامیابی پر سرت کا اظہار کیا، مقررون کا شکریہ ادا فرمایا اور مسلسل کام کئے جانے کی ضرورت کا اظہار فرمایا۔ مولوی مرزا محمد بیگ صاحب اولیٰ تعلقہ دارباغات نے جناب صدر کے شکریہ کی تحریک پیش کی اور ان سب خواہین و اصحاب کا شکریہ ادا کیا۔ چکی کوشش وسیع سے کانفرنس اس قدر کامیاب اور بارور بنی ہوئی۔

مولانا سید محمد بادشاہ حسینی صاحب نے اعلیٰ حضرت ہندوستان عالی مقام، اعلیٰ اور شاہزادگان والا نشان و شاہزادیاں والا تبار اور خانوادہ آصفی کی صحت و سلامتی کے لئے دعا کی جس پر کانفرنس کا گیارہواں

ضمیمہ ماقول

فہرست اراکین تنظیم

۱	جناب مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب صدر	۱۸	جناب مولوی محمد عبدالرحیم صاحب
۲	محمد منظر صاحب	۱۹	ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب بی۔ بیچ۔ ڈی
۳	مولوی محمد غوث صاحب ایم۔ اے۔ ال۔ بی۔ شریک	۲۰	مولوی فضل اللہ احمد صاحب بی۔ اے
	ارکان بلده	۲۱	ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی۔ بیچ۔ ڈی
۴	جناب مولوی محمد اکبر علی صاحب	۲۲	مولوی میر اکبر علی خان صاحب بی۔ اے بیرسٹریٹ
۵	مولوی مرزا محمد بیگ صاحب	۲۳	مولوی حکیم شفا صاحب
۶	مولوی محمد فیض الدین صاحب ڈوکیٹ	۲۴	مولوی سید محمد نعفی صاحب
۷	مولوی محمد شمس الدین صاحب منصف و قیڈ	۲۵	مولوی احمد علی الدین صاحب بیچ۔ سی۔ بیس
۸	ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر	۲۶	مولوی محمد احمد اللہ صاحب بیچ۔ سی۔ بیس
۹	نواب میر محمود علی خاں صاحب	۲۷	مولوی محمد فیض الدین صاحب ایم۔ اے
۱۰	مولوی حسین عبدالنعم صاحب بی۔ اے	۲۸	مولوی محمد عبدالرزاق صاحب بی۔ اے چیدہ
۱۱	ڈاکٹر شیخ سالار مسود صاحب	۲۹	نواب بہادر یار جنگ بہادر
۱۲	مولوی عبدالوہاب صاحب خدیب	۳۰	مولوی خواجہ محمد احمد صاحب ایم۔ اے
۱۳	مولوی سید محمد حیات الحسن صاحب نقوی	۳۱	مولوی غلام قادر صاحب بی۔ اے
۱۴	نواب ممتاز یار الدولہ بہادر	۳۲	ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ایم۔ اے۔ ڈی ٹ
۱۵	مولوی محمد حبیب الرحمن صاحب ایم۔ اے۔ ال۔ بی۔ شریک	۳۳	ڈاکٹر سید حسین صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ بیچ۔ ڈی
۱۶	مولوی محمد خیر الدین صاحب	۳۴	ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔ اے
۱۷	مولوی حاجی سید قادر محمدی الدین صاحب		بی۔ بیچ۔ ڈی بیرسٹریٹ

۳۵	جناب ڈاکٹر محمد منی الدین صاحب تہی ایم۔ پی۔ بی۔ ڈی	۴۸	مولوی شیخ محمد غوث صاحب کھیل سدی پٹ
۳۶	ڈاکٹر سید محی الدین ممتاز درایم اے۔ پی۔ بی۔ ڈی	۴۹	مولوی سید ذوالفقار علی صاحب حقانی۔ بی۔ اے
۳۷	ارستینا نارین صاحب بی ایس سی۔	۵۰	مولوی سعید الدین حسین صاحب دوم تعلقدار مومن آباد
۳۸	مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی	۵۱	مولوی شیخ ابوالحسن صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی
۳۹	مولوی امرا اللہ صاحب صدیقی پی۔ اے۔ بیرسٹریٹ لا	۵۲	مولوی عبدالعزیز خان صاحب بی۔ اے
۴۰	مولوی قادر حسین خان صاحب ایم اے۔	۵۳	مولوی محمد فاسم صاحب کٹر کٹر بلندو
۴۱	مولوی محمد فاروق صاحب بی۔ سی۔ بی۔ ٹی	۵۴	پینڈت سر نیواس راؤ صاحب کھیل
ارکان ضلاع		۵۵	نواب فیض جنگ بہادر
		۵۶	مولوی سید محمد حسین صاحب نیدی کھیل
۴۲	مولوی عبد الباق صاحب نظم مدار پچور	۵۷	مولوی عبد الوہاب صاحب نگار نظامی گھر گ
۴۳	مولوی سید بہار الدین صاحب شطاری شصت	۵۸	مولوی سید باسط علی خان صاحب علم صدقات
۴۴	مولوی محمد عبد اللہ صاحب کھیل ناندر	۵۹	مولوی محمد عبدالرؤف صاحب دوم تعلقدار گلبرگ
۴۵	مولوی غلام احمد خان صاحب مدار ونگ	۶۰	مولوی سرزا احمد فاروق بیگ صاحب بی۔ اے
۴۶	مولوی شیخ چنو صاحب کھیل پٹنی	۶۱	بی۔ سی۔ بیس لاٹور
۴۷	مولوی سید نور المنیب اللہ صاحب شصت		

ضمیمہ دوم

رزولوشن اے۔ کانفرنس جو سرکار عالی نے منظور فرمائے

تعلیمی تحریکات

- ۱۔ ابتدائی تعلیم پر زیادہ توجہ ہونی چاہیے۔
- ۲۔ قیام سررشتہ ترجمہ علوم و فنون۔
- ۳۔ تعلیم نسواں کی توسیع۔
- ۴۔ انجینیری کی اردو تعلیم اور انجینئرنگ سکول کی زرقی۔
- ۵۔ انی اسکولوں میں تجارتی شعبہ کی تعلیم کا انتظام۔
- ۶۔ امتحان پرائمری کے لئے مستقر ضلع پر طلبہ کے اجتماع کی عدم ضرورت۔
- ۷۔ تالیفات و تراجم کے لئے انعامی موصول کی ترویج۔

(۸۶) سرشتہ صنعت و حرفت کا قیام۔ (۲۵) ایجوکیشنل بک ڈپو کا قیام۔
 (۹۱) فوقانی مدارس اور کالج کی تعلیم کے لئے باہر جانے (۲۶) ورزش جسمانی و خطانِ صحت کی کافی تعلیم کا انتظام
 کے وجوہ کی دریافت اور چارہ کار بذریعہ قیام یونیورسٹی (۲۷) اضافہ وظائف کالج
 (۱۰۱) تعلیمی اوقاف کو مذہبی تعلیم کے لئے کام میں لانا (۲۸) فراموشی عہد و ذریعہ سرشتہ مردم شماری نسبت واقفیت
 (۱۱۱) ذاکرہ تعلیم کا انتظام اردو کے ذریعہ۔ (۲۹) ہر صنعت خلع و توبہائی اسکول اور ہر صنعت تحصیل پانچ ہزار روپے
 (۱۳) ابتدائی مدارس میں تعلیم بلا اخراجات۔ والے ضلع میں ڈل اسکول کا قیام

(۱۳۱) صنایع و بلدیہ میں ہائی اسکولوں کے ساتھ دارالافتاء (۳۰) تعمیر عمارات مدارس

کامیاب کے میدانوں کا انتظام (۳۱)

(۱۴) اوقاف کی فہرست کی ترتیب (۳۲) تعلیمات میں طلبہ کے سیر و تفریح کا انتظام
 (۱۵) امتحان ڈل میں فارسی کو بطور نقل زبان کے لینے (۳۳) سرشتہ زراعت کی دست مزدوروں وغیرہ کے ذریعہ
 کا اختیار۔

ثروتی تحریکات

(۱۶) امتحانات سرشتہ میں ملی امتحانات کے کامیابی کی
 (۱۷) سرشتہ تالیف و ترجمہ کے ذریعہ عربی کتب کے تراجم (۳۴) تحقیقات برائے اصلاح حالت معاشی ملک ترقی و ذرائع ثروت
 کا انتظام (۳۵) معافی محصول درآمدیہ مصنوعات۔

(۱۸) مدارس ابتدائی کے مدرسین کی ماہوار میں اضافہ (۳۶) سرشتہ اعداد و شمار کی توسیع۔

(۱۹) بہم رسانی مکانات بلئے مدارس ابتدائی۔ (۳۷) بیرونی کمپنیوں کو قیام کی اجازت کی صورت میں ملکی
 (۲۰) بیرونی اعلیٰ تعلیم کے لئے قرضہ عطا ہونا۔ سرمایہ کی شرکت کا زوم۔

(۲۱) سرکار عالی کے سولہ بیوروں کے لئے قوانین و ضوابط (۳۸) بیگار کی موقوفی۔

سرکار عالی کی واقفیت کو لازم قرار دینا۔ (۳۹) ذرائع آب سانی کا قیام مستقر صنایع و لا تو ریں

(۲۲) اردو و کتب خانہ کا قیام۔ (۴۰) انسداد مسکرات۔

(۲۳) جزا فیہ و تالیخ دکن کی تعلیم کا انتظام۔ (۴۱) مویشی کی نسل کی ترقی

(۲۴) عہدہ ہائے عدالتی و وکالت کے لئے ایک اعلیٰ

امتحان کا مقرر کیا جانا۔

مختصر کیفیت سب کھٹی پڑنی حسب ذیل ہے۔

پربنی میں کانفرنس کا جلسہ عام ہونے کے بعد ۱۳۳۲ء میں سب کھٹی کے پاس مبلغ (لکھنوی لکھنوی) چودہ ہزار نو سو اونچاس گیارہ آنے پر پائی باقی رہے۔

سب کھٹی نے صدر کھٹی حیدر آباد کو (مستطعمہ) اور مدرسہ پرستک ملتان پربنی کو (المکرمہ) اس وقت تک جو وظائف دے گئے (لکھنوی) (مستطعمہ) تعلیمی اخراجات کے لئے اس وقت کھٹی کے قبضہ میں جائداد غیر منقولہ اراضیات و مکانات قیمتی لے گئے گیارہ ہزار سو چوبیس جائداد غیر منقولہ اس لئے لٹگئی ہے۔ کہ اس کے منافع سے دو اٹا وظایف جاری رہیں۔

ضمیمہ سوم

یادداشت متعلق وظائف کانفرنس ۱۳۳۲ء

اسکول لیوننگ سٹیفٹ

- (۹۴) طلبہ کی امداد کی گئی۔ (۴) (دو کامیاب اور دو نپل سکنے والے طلبہ) کو بھرتی کیا۔
- (۹۵) طلبہ کامیاب ہوئے۔ (۵) صاحب نیپے بی سے ریڈیو کے کام میں ہمارے پید کی
- (۱) طالب علم نے بی بی یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ (۱۱) طلبہ نے بدوران تعلیم درجہ چھوڑ دیا۔
- (۳) طلبہ نے عثمانیہ میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ (۱۱) طلبہ ابھی زیر تعلیم ہیں۔
- (۲۴) کامیاب طلبہ کو انٹرمیڈیٹ کے لئے امداد دی گئی (۲۱) طلبہ ابھی زیر تعلیم ہیں۔
- جو طلبہ کامیاب ہوئے اور بعد میں کانفرنس نے ان کی اعانت نہ کی ان میں سے ایک نے علی گڑھ سے ایم۔ اے۔ ایل میں بی کیا۔ لازماً اختیار کی اور بعد ازاں امتحان سے فن تعلیم کی ڈگری حاصل کی ایک صاحب نے بی۔ اے کامیاب کیا۔
- ایک صاحب نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے۔ ال۔ ال بی کیا اور تین صاحبوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کیا۔

طالب علم	محبوبہ کالج سکندر آباد	۳۲ طلبہ	شی ہائی اسکول
۲ طلبہ	مدرسہ اعزاز	۳۳ طلبہ	چادر گھاٹ ہائی اسکول
طالب علم	گلبرگ ہائی اسکول	۵ طلبہ	آل سٹیز ہائی اسکول
۱ ۱ ۱	ویو یک وروجنی	۱ طالب علم	ورنگل ہائی اسکول
۱ ۱ ۱	مفید الانام	۶ طلبہ	اوزنگ آباد ہائی اسکول
۱ ۱ ۱	مدرسہ عالیہ	۱ طالب علم	بیدر ہائی اسکول

عثمانیہ میٹرک

(۸۰) طلبہ کی امداد کی گئی۔
(۸۱) کامیاب طالب علم کو پیر بارڈی نیٹ انجینئرنگ کے لئے امداد دی گئی۔

(۸۲) طلبہ کامیاب ہوئے
(۸۳) طالب علم نے بھی میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ (۸۴) کامیاب طالب علم کو ام بی بی ایس کے لئے امداد دی گئی
(۸۵) کامیاب طلبہ کو انٹرمیڈیٹ کے لئے امداد دی گئی۔ (۸۶) طلبہ نے بدوران تعلیم مدرسہ چھوڑ دیا۔

جو طلبہ کامیاب ہوئے اور بعد میں کانفرنس نے ان کی اعانت نہ کی ان میں سے ایک نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کیا اور بعد میں جامعہ عثمانیہ کے وظیفہ سے علیگڑھ میں معاشیات میں ایم۔ اے کیا۔

ایک صاحب نے جامعہ عثمانیہ سے ایم بی سی اور بی ای کے امتحانات کامیاب کئے اب اسٹنٹ انجینیر ہیں۔

ایک صاحب نے عثمانیہ سے بی۔ اے۔ ال ہال بی کیا اب کیل ہائی کورٹ ہیں۔

ایک صاحب نے عثمانیہ سے بی اے کیا۔

ایک اور صاحب نے بھی عثمانیہ سے بی اے کیا۔

چار طالبات کی امداد کی گئی لیکن ان میں سے کسی نے کامیابی حاصل نہیں کی۔

دارالعلوم	۳۰۱ طلبہ	ہاسپی ہائی اسکول	۳ طالب علم
شی ہائی اسکول	(۱۶) طلبہ	ہاسپی زنانہ اسکول	۳ طالبات
مفید الانام	۱۱ طالب علم	مدرسہ آصفیہ	۱ طالب علم

دارشفاہی سکول	۳	طالب علم	جنچل گوڑو	۱	طالب علم
مدرسہ فوقانیہ پر مبنی	۱	"	مدرسہ فوقانیہ میدک	۱	"
" میدک	۱	"	" انوار العلوم ہائی سکول	۱	"
" چارمحل	۱	"	" کلسیہ ہائی سکول	۱	"
مدرسہ نواں کاچی گوڑو	۱	"	ان کے علاوہ تین طلبہ کو پنجاب میٹرک کے لئے امداد دی گئی		
			جو کامیاب ہوئے۔		

انٹرمیڈیٹ

- (۲۱۵) طلبہ کی امداد کی گئی۔ طلبہ نے کامیابی حاصل کی۔
- (۵۳) کامیاب طلبہ کو بی۔ اے کیلئے امداد دی گئی۔ (۵) کامیاب طلبہ کو بی۔ بی۔ سی کے لئے امداد کی گئی۔
- (۲) کامیاب طلبہ کو ایم۔ بی۔ بی۔ بی۔ سی کے لئے امداد دی گئی۔ (۱) ایک کامیاب طالب علم کو بی۔ بی۔ سی کے لئے امداد دی گئی۔
- (۱۱) کامیاب طالب علم کو بی۔ بی۔ اے کے لئے امداد دی گئی۔ (۲) ذیل سننے والے طلبہ کو انجینئرنگ کے لئے امداد دی گئی۔
- (۱۴) طالب علموں نے بدوران تعلیم کا بیج چھوڑ دیا۔ طلبہ ابھی زیر تعلیم ہیں۔
- (۳) طلبہ کا بدوران تعلیم انتقال ہو گا۔
- جو طلبہ کامیاب ہوئے اور ان کی امداد میں کانفرنس سے نہیں ہوئی ان میں تین حیدرآباد سول سروس کے رکن ہیں۔

- ایک صاحب نے علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ ایک صاحب نے بمبئی سے بی۔ اے کیا۔
- تین صاحبوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے ال۔ بی۔ اے کیا۔ ایک اور صاحب نے عثمانیہ سے بی۔ اے ال۔ بی۔ اے کیا۔
- ایک صاحب نے عثمانیہ سے ایم۔ اے ال۔ بی۔ اے کیا۔ ایک صاحب نے عثمانیہ سے بی۔ اے کیا۔
- ایک صاحب نے علی گڑھ سے ایم۔ اے ال۔ بی۔ اے کیا۔ ایک صاحب نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کیا، علی گڑھ سے ایم۔ اے اور کیرج سے بی۔ اے

نظام کالج	۹	طلبہ
محاڈن کالج مدراس	۱	طالب علم
کلیہ جامعہ عثمانیہ	۸۷	طلبہ
سٹی کالج	۱۱	"
اورنگ آباد کالج	۲	"
گلبرگ کالج	۱	طالب علم
علی گڑھ	۵	طلبہ
بہمنی	۳	"
لاہور	۱	طالب علم

جامعہ عثمانیہ

۱۰۱

طلبہ

بی۔ اے

(۱۱۹) طلبہ کی امداد کی گئی۔ (۸۳) طلبہ نے کامیابی حاصل کی۔

(۸۱) کامیاب طلبہ کو ایل ایل بی کے لئے امداد کی گئی۔ (۱۱) صاحب کو مدراس کے انجینئرنگ کالج کے لئے امداد کی گئی۔
(۶) طالب علموں نے بدوران تعلیم کالج چھوڑ دیا۔ (۱۱) طالب علم ابھی زیر تعلیم ہے۔
دو اصحاب بعد کامیابی بلا امداد کانفرنس الہ آباد سے ال ال بی ہوئے اور برٹش انڈیا میں وکالت کرتے ہیں۔

ایک صاحب بہمنی سے بعد کامیابی بلا امداد کانفرنس ال ال بی ہوئے اور وکالت کرتے ہیں۔
(۷) اصحاب بعد کامیابی بلا امداد کانفرنس عثمانیہ سے ال ال بی ہوئے اور سوادو کے باقی وکالت کرتے ہیں۔

(۸) اصحاب بعد کامیابی بلا امداد کانفرنس ام کے ہوئے، تین کلیات جامعہ عثمانیہ کے پڑھارہیں۔
اسی طرح ایک صاحب نے علی گڑھ سے ایم بی سی کیا۔
ایک صاحب کو انگلستان میں فن طب کی تکمیل کے لئے سرکاری وظیفہ ملا۔
ایک صاحب نے سرکاری وظیفہ سے انگلستان میں ڈاکٹر اپٹ حاصل کیا۔

نظام کالج	۲۰	طالب علم	جامعہ عثمانیہ	۵۲	طالب علم
علی گڑھ	۵	"	بمبئی	۱	"
الہ آباد	۱	"	لاہور	۱	"

بی۔ بی۔ سی

- (۳۲) طلبہ کی امداد کی گئی۔
 (۲) طالب علم نے بغیر تکمیل تعلیم چھوڑ دی۔
 (۱) طالب علم تعلیم پڑا ہے
 ایک صاحب نے تعلیم چھوڑ کر حیدرآباد سول سروس میں کامیابی حاصل کی۔
 ایک صاحب نے عثمانیہ سے ایم بی سی کی تکمیل کر لی۔

نظام کالج	۱	طالب علم	علی گڑھ	۲	طلبہ
جامعہ عثمانیہ	۱۵	طلبہ	جامعہ ملیہ دہلی	۱	طالب علم
کلکتہ	۱	طالب علم			

مڈیکل

- مڈیکل کے لئے (۳۶) طلبہ کی امداد کی گئی۔ ان میں ۸ طلبہ نے تعلیم ترک کر دی۔
 (۴) طلبہ نے سب اسٹنٹ سرجن کا امتحان کامیاب کیا (۶) طلبہ نے اسٹنٹ سرجن کا امتحان کامیاب کیا۔
 (۹) طلبہ نے ایم بی بی سی کا امتحان کامیاب کیا۔ (۱) زیر تعلیم مدارس یونیورسٹی۔ برائے ایم بی بی سی (خاتون)
 جن اصحاب نے تعلیم چھوڑ دی ان میں ایک جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے ال ال بی ہوئے۔

انجینئرنگ

- (۵۳) طلبہ کی امداد کی گئی۔
 (۸) طلبہ نے تعلیم ترک کر دی۔
 (۷) طلبہ نے پورسب رڈی اینٹ کی تکمیل کی۔ (۲۶) طلبہ نے پورسب رڈی اینٹ کی تکمیل کی۔

۱۱، طالب علم نے در اس سے بی۔ ای کی تکمیل کی بعد میں اٹھکستان میں بی تکمیل کی۔
 ۱۲، طلبہ نے جامعہ ثنائیہ سے بی۔ ای کامیاب کیا۔

علوم مشرقیہ

اوزنگ آباد مدرسہ فوقانیہ	طلبہ	۳	منشی
دارالعلوم	"	۴	دبیر
اوزنگ آباد مدرسہ فوقانیہ	"	۳	مولوی
تکمیل نہیں کی، دارالعلوم	"	۲	عالم
دارالعلوم	طالب علم	۱	فاضل
دیوبند،	طلبہ	۲	"
ندوہ لکھنؤ،	"	۱	"

متفرق

طالب علم کامیاب	۳	اوزنگ	۱	پارچہ بانی
"	"	ڈپلومان انٹرنکس اس	۱	علاج حیوانات
"	"	ان کو بعد میں سرکار سے یوروپین وظیفہ ملا۔	۱	آرکٹکچر بمبئی
"	"	ایک لکھیا دو نے تکمیل نہیں کی	۳	ممکنہ
"	"	"	۳	ٹریننگ ان ایجوکیشن

[illegible]

۱۳۴۳	۱۳۴۲	۱۳۴۱	۱۳۴۰	۱۳۳۹	۱۳۳۸	۱۳۳۷	۱۳۳۶	۱۳۳۵	۱۳۳۴	۱۳۳۳	۱۳۳۲	۱۳۳۱	۱۳۳۰	۱۳۲۹	۱۳۲۸	۱۳۲۷	۱۳۲۶	۱۳۲۵	۱۳۲۴	۱۳۲۳	۱۳۲۲	۱۳۲۱	۱۳۲۰	۱۳۱۹	۱۳۱۸	۱۳۱۷	۱۳۱۶	۱۳۱۵	۱۳۱۴	۱۳۱۳	۱۳۱۲	۱۳۱۱	۱۳۱۰	۱۳۰۹	۱۳۰۸	۱۳۰۷	۱۳۰۶	۱۳۰۵	۱۳۰۴	۱۳۰۳	۱۳۰۲	۱۳۰۱	۱۳۰۰	۱۲۹۹	۱۲۹۸	۱۲۹۷	۱۲۹۶	۱۲۹۵	۱۲۹۴	۱۲۹۳	۱۲۹۲	۱۲۹۱	۱۲۹۰	۱۲۸۹	۱۲۸۸	۱۲۸۷	۱۲۸۶	۱۲۸۵	۱۲۸۴	۱۲۸۳	۱۲۸۲	۱۲۸۱	۱۲۸۰	۱۲۷۹	۱۲۷۸	۱۲۷۷	۱۲۷۶	۱۲۷۵	۱۲۷۴	۱۲۷۳	۱۲۷۲	۱۲۷۱	۱۲۷۰	۱۲۶۹	۱۲۶۸	۱۲۶۷	۱۲۶۶	۱۲۶۵	۱۲۶۴	۱۲۶۳	۱۲۶۲	۱۲۶۱	۱۲۶۰	۱۲۵۹	۱۲۵۸	۱۲۵۷	۱۲۵۶	۱۲۵۵	۱۲۵۴	۱۲۵۳	۱۲۵۲	۱۲۵۱	۱۲۵۰	۱۲۴۹	۱۲۴۸	۱۲۴۷	۱۲۴۶	۱۲۴۵	۱۲۴۴	۱۲۴۳	۱۲۴۲	۱۲۴۱	۱۲۴۰	۱۲۳۹	۱۲۳۸	۱۲۳۷	۱۲۳۶	۱۲۳۵	۱۲۳۴	۱۲۳۳	۱۲۳۲	۱۲۳۱	۱۲۳۰	۱۲۲۹	۱۲۲۸	۱۲۲۷	۱۲۲۶	۱۲۲۵	۱۲۲۴	۱۲۲۳	۱۲۲۲	۱۲۲۱	۱۲۲۰	۱۲۱۹	۱۲۱۸	۱۲۱۷	۱۲۱۶	۱۲۱۵	۱۲۱۴	۱۲۱۳	۱۲۱۲	۱۲۱۱	۱۲۱۰	۱۲۰۹	۱۲۰۸	۱۲۰۷	۱۲۰۶	۱۲۰۵	۱۲۰۴	۱۲۰۳	۱۲۰۲	۱۲۰۱	۱۲۰۰	۱۱۹۹	۱۱۹۸	۱۱۹۷	۱۱۹۶	۱۱۹۵	۱۱۹۴	۱۱۹۳	۱۱۹۲	۱۱۹۱	۱۱۹۰	۱۱۸۹	۱۱۸۸	۱۱۸۷	۱۱۸۶	۱۱۸۵	۱۱۸۴	۱۱۸۳	۱۱۸۲	۱۱۸۱	۱۱۸۰	۱۱۷۹	۱۱۷۸	۱۱۷۷	۱۱۷۶	۱۱۷۵	۱۱۷۴	۱۱۷۳	۱۱۷۲	۱۱۷۱	۱۱۷۰	۱۱۶۹	۱۱۶۸	۱۱۶۷	۱۱۶۶	۱۱۶۵	۱۱۶۴	۱۱۶۳	۱۱۶۲	۱۱۶۱	۱۱۶۰	۱۱۵۹	۱۱۵۸	۱۱۵۷	۱۱۵۶	۱۱۵۵	۱۱۵۴	۱۱۵۳	۱۱۵۲	۱۱۵۱	۱۱۵۰	۱۱۴۹	۱۱۴۸	۱۱۴۷	۱۱۴۶	۱۱۴۵	۱۱۴۴	۱۱۴۳	۱۱۴۲	۱۱۴۱	۱۱۴۰	۱۱۳۹	۱۱۳۸	۱۱۳۷	۱۱۳۶	۱۱۳۵	۱۱۳۴	۱۱۳۳	۱۱۳۲	۱۱۳۱	۱۱۳۰	۱۱۲۹	۱۱۲۸	۱۱۲۷	۱۱۲۶	۱۱۲۵	۱۱۲۴	۱۱۲۳	۱۱۲۲	۱۱۲۱	۱۱۲۰	۱۱۱۹	۱۱۱۸	۱۱۱۷	۱۱۱۶	۱۱۱۵	۱۱۱۴	۱۱۱۳	۱۱۱۲	۱۱۱۱	۱۱۱۰	۱۱۰۹	۱۱۰۸	۱۱۰۷	۱۱۰۶	۱۱۰۵	۱۱۰۴	۱۱۰۳	۱۱۰۲	۱۱۰۱	۱۱۰۰	۱۰۹۹	۱۰۹۸	۱۰۹۷	۱۰۹۶	۱۰۹۵	۱۰۹۴	۱۰۹۳	۱۰۹۲	۱۰۹۱	۱۰۹۰	۱۰۸۹	۱۰۸۸	۱۰۸۷	۱۰۸۶	۱۰۸۵	۱۰۸۴	۱۰۸۳	۱۰۸۲	۱۰۸۱	۱۰۸۰	۱۰۷۹	۱۰۷۸	۱۰۷۷	۱۰۷۶	۱۰۷۵	۱۰۷۴	۱۰۷۳	۱۰۷۲	۱۰۷۱	۱۰۷۰	۱۰۶۹	۱۰۶۸	۱۰۶۷	۱۰۶۶	۱۰۶۵	۱۰۶۴	۱۰۶۳	۱۰۶۲	۱۰۶۱	۱۰۶۰	۱۰۵۹	۱۰۵۸	۱۰۵۷	۱۰۵۶	۱۰۵۵	۱۰۵۴	۱۰۵۳	۱۰۵۲
------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------	------

گوشواره خرج منابت ایدیم اسفندار ^{۳۲۴} لغایت آخر دی بهشت ^{۳۲۵}

て

[illegible]

[illegible]

سلک یکم خورداد ۱۳۲۴ ف ۱۵۱۱ حب تفصیل ذیل

محفوظ فکسڈ پازٹ حیدر آباد کو اپر ٹیوٹ و مین بینک محمد علی علیہ السلام

کونٹ اکونٹ اپریل بنک حیدرآباد دکن مسیح

۵۰۰

١٥
 ١٥
 ١٥

وفت

ضمیمہ پنجم فہرست ارکان کانفرنس

اسماء ارکان دوامی

تثانیہ نام اراکین دوامی عہد پتہ تثانیہ نام اراکین دوامی عہد پتہ

۱	مولوی محمد اکبر علی صاحب	مہتمم صحیفہ	بلدہ	۱۶	ڈاکٹر شیخ سالار حسن صاحب	اسٹنٹ جرنل	بلدہ
۲	" شیخ محمد غوث صاحب	وکیل	سیدی ٹوٹہ	۱۷	مولوی تراز علی صاحب	وکیل	لاہور
۳	" ناصر محمد صاحب	قلمبدار	"	۱۸	نارائن راؤ صاحب	وکیل	"
۴	ترک راؤ صاحب	وکیل	ادوگیر	۱۹	گنپت راؤ صاحب	بھلی	"
۵	دیرائونٹ راؤ صاحب (انجمنی)	"	"	۲۰	مکندر راؤ صاحب	"	"
۶	مولوی محمد سجاد علی صاحب	دوم تعلقہ دار	باب	۲۱	مادھو نارائن راؤ صاحب	"	"
۷	نواب میر محمد علی خان صاحب	ڈپٹی تعلقہ دار	بلدہ	۲۲	مولوی محمد حنیف صاحب	"	"
۸	نواب صدیق جنگ بہادر	سابق صدر	ہلنگدہ	۲۳	مولوی فضل الرحمن صاحب	کورٹ انکپٹر	گلبرگ
۹	مولوی شاہ عالم خان صاحب	کیاں انکپٹر	بلدہ	۲۴	مولوی محمد جان صاحب	تحصیل دار	بلدہ
۱۰	مولوی محمد دستگیر صاحب	تحصیل دار	"	۲۵	نویہ بالاجی صاحب	ڈیسک	"
۱۱	محل مولوی دستگیر صاحب	"	"	۲۶	دھونڈ راؤ صاحب	وکیل	لاہور
۱۲	مولوی محمد عبدالوہاب صاحب	مستلم ساجد	"	۲۷	بھگونت بالاجی صاحب	پٹیل	قصبہ تیر
۱۳	ڈاکٹر محمد امین الدین صاحب	انسپکٹر	گلبرگ	۲۸	فتح چند جیوراج صاحب	ساہو	کلم
۱۴	سنگ تنی صاحب	پٹیل	ساکول ٹیٹہ	۲۹	مولوی سید ارشد الحسنی صاحب	"	لوہارا
۱۵	مولوی محمد عبدالباسط صاحب	ناظم عدالت	راجپور	۳۰	مولوی ابوالقاسم سید محمد صاحب	تحصیل دار	"

بلده	نواب ابو الفتح خاں بہادر	۳۸	منصف	مولوی عبدالرؤف صاحب	۳۱
"	نواب کراست جنگ مرحوم	۳۹	نیلنگہ	رام کشن ناگ صاحب	۳۲
"	نواب شیر نواز جنگ بہادر	۴۰	لا تورا	کشن راؤ صاحب	۳۳
"	نواب علی یار جنگ بہادر	۴۱	"	مولوی سید الزماں صاحب	۳۴
"	نواب محمد الدین یار جنگ بہادر	۴۲	"	فرزند محمد دستگیر صاحب	۳۵
"	نواب محمد ولی داؤ خاں بہادر	۴۳	"	مولوی حسن الزماں صاحب	۳۶
"	نواب لطیف لدو لہ بہادر	۴۴	"	فرزند محمد دستگیر صاحب	۳۷
"	مرحوم		"	ختر مولوی محمد دستگیر صاحب	۳۸
"	راجہ راجہ سیراؤ بہادر	۴۵	بلده	مولوی سید غوث علی صاحب	۳۹
والی سمنان دوم کٹہہ			ناظم قردیوانی بال		

اسماء ارکان

نشانی	نام ارکان	عہدہ	پتہ	نشانی	نام ارکان	عہدہ	پتہ
۱	مولوی غلام قادر صاحب	دوم تعلقات و فیضیاء	بلده	۱۲	مولوی محمد اکرام عیسا صاحب	بلده	۱۲
۲	مولوی خواجہ محمد عیسا صاحب	بلده	"	۱۳	مولوی احمد علی الدین منیاں صاحب	بلده	۱۳
۳	مولوی میر اکبر عیسا صاحب	بلده	"	۱۴	مولوی سید نور الدین صاحب	بلده	۱۴
۴	مولوی محمد حبیب الرحمن صاحب	بلده	"	۱۵	مولوی بی محمد حیات الرحمن صاحب	بلده	۱۵
۵	مولوی محمد عبدالرحیم صاحب	بلده	"	۱۶	مولوی محمد فیض الدین صاحب	بلده	۱۶
۶	مولوی غلام احمد خان صاحب	بلده	"	۱۷	مولوی محمد شمس الدین صاحب	بلده	۱۷
۷	ڈاکٹر نظام الدین منیاں صاحب	بلده	"	۱۸	مولوی میر ولی الدین صاحب	بلده	۱۸
۸	مولوی مرزا عجب گنج صاحب	بلده	"	۱۹	مولوی عبد الغفر خان صاحب	بلده	۱۹
۹	مولوی محمد احمد اللہ صاحب	بلده	"	۲۰	مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب	بلده	۲۰
۱۰	نواب بہادر یار جنگ بہادر	بلده	"	۲۱	مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب	بلده	۲۱
۱۱	مولوی محمد قاسم صاحب	بلده	"	۲۲	مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب	بلده	۲۲

۲۱	ڈاکٹر عبداللطیف صاحبی ریاحی	پروفیسر عثمانیہ کالج	بلدہ	۲۲	یم زنگ داؤ صاحب	ایڈمیت	بلدہ
۲۲	ڈاکٹر نواب طرہا جنگ بھادر	رکن مجلس عدالت	"	۲۳	مولوی محمد مبارز الدین صاحب	مستندینہ افغانی	"
۲۳	مولوی شیخ جنو صاحب	وکیل	پربھنی	۲۴	مولوی قاضی محمد حسین صاحب	نائبین امیر جمہوریہ	"
۲۴	مولوی محمد عبدالرزاق صاحب	منظم نظامت کے دیگر	بلدہ	۲۵	مولوی علی الدین احمد صاحب	ناظم امور مذہبی	"
۲۵	ڈاکٹر حسین صاحبی بیجہ	پروفیسر عثمانیہ کالج	"	۲۶	مولوی محمد جہانگیر حسین صاحب	وکیل	"
۲۶	ڈاکٹر رضی الدین صاحب	پروفیسر ریاضی عثمانیہ	"	۲۷	مولوی شمس الدین صاحب	منصف فیض آباد	"
۲۷	ڈاکٹر سید علی حسین صاحب	مددگار پروفیسر کالج	"	۲۸	مولوی محمد عبدالرؤف صاحب	مددگار صوبہ دار	گلبرگر خریف
۲۸	آسیہ تارا ن صاحبی لیس	پچھڑا طبعیات جانشین	"	۲۹	مولوی سید محمد عظیم خان صاحب	پروفیسر نظام کالج	بلدہ
۲۹	ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحبی بیجہ	پچھڑا جاسو عثمانیہ	"	۳۰	مولوی محمد غوث صاحب	بی ایس سی	"
۳۰	مولوی محمد غوث صاحب	جائیت سرگرمی	"	۳۱	مولوی شیخ ابوالحسن صاحبی	صدر مہتم تعلیمات	درنگ
۳۱	مولوی شیخ ابوالحسن صاحبی	ملتی	"	۳۲	مولوی مرزا محمد بیگ صاحب	اول تعلقہ اربانت	بلدہ
۳۲	مولوی محمد سعید الدین حسین صاحب	دوم تعلقہ دار	سومن آباد	۳۳	مولوی محمد سعید الدین حسین صاحب	رجسٹرار	بلدہ
۳۳	مولوی محمد سعید الدین حسین صاحب	رجسٹرار	بلدہ	۳۴	مولوی محمد ارمند صاحب	بیسرٹراٹ	"
۳۴	مولوی محمد ارمند صاحب	بیسرٹراٹ	"	۳۵	مولوی حاجی فیصل علی صاحب	مستند خادم الملین	"
۳۵	مولوی حاجی فیصل علی صاحب	مستند خادم الملین	"	۳۶	راجہ بہادر دیکھ مارا صاحب	کو توال وظیفہ یاب	"
۳۶	راجہ بہادر دیکھ مارا صاحب	کو توال وظیفہ یاب	"	۳۷	نواب غازی یا جنگ بھادر	انکسٹریکٹ ڈیفندر	"
۳۷	نواب غازی یا جنگ بھادر	انکسٹریکٹ ڈیفندر	"	۳۸	مولوی میر حسین جہانگیر صاحب	جاگیر دار	"
۳۸	مولوی میر حسین جہانگیر صاحب	جاگیر دار	"	۳۹	مولوی سید سلیم شاہ صاحب	پیشین ڈیفندر مال	"
۳۹	مولوی سید سلیم شاہ صاحب	پیشین ڈیفندر مال	"	۴۰	مولوی محمد فیض الدین صاحب	بی ایس سی	"
۴۰	مولوی محمد فیض الدین صاحب	بی ایس سی	"	۴۱	مولوی سید محمد صاحب	اسٹنٹ پروفیسر	"
۴۱	مولوی سید محمد صاحب	اسٹنٹ پروفیسر	"	۴۲	مولوی محمد عبدالرحیم صاحب	اسٹنٹ پروفیسر	"

۶۰	ڈاکٹر فیصل الدین صاحب	بلدہ	۶۸	مولوی رشید احمد صاحب	رکن دارالترجمہ	بلدہ
	پی تیج - ڈی -		۶۹	مولوی خواجہ محمد احمد صاحب	ہستم عجائب خانہ	"
۶۱	مولوی محمد فادوق صاحب	دو گارہ بلدہ	"	ایم - اے - مولوی خواجہ حسین الدین صاحب	مسجد بابا بکھت	"
۶۲	بی - اے - پیج - سی - یس مولوی سید محمود صاحب	شریک مسند ورنگل	۸۰	پیج - سی - یس مولوی غلام مصطفیٰ صاحب	دو گارہ بابا بکھت	"
۶۳	مولوی فادوق الدین صاحب	اسلامیٹی اسکول	۸۱	مولوی عبدالحلیم صاحب	دو گارہ مسند فوج	"
۶۴	بی - اے - بی تی مولوی سید فیض حسن صاحب	اسلامیٹی اسکول	۸۲	مولوی محمد فاقم صاحب	جنرل کٹر اکثر	بلدہ
۶۵	مولوی میر فیاض احمد صاحب	ناظم عداوت	۸۳	مولوی ابوالدیان خواجہ	الکے کتبہ علیہ	بلدہ
۶۶	مولوی عبدالحمد صاحب	پرہی	۸۴	بہار الدین صاحب	نائب ستم مال	"
۶۷	بی - ای سر اننگار	اسنت انجیر تھرا	۸۵	مولوی سید بدر الدین حسین صاحب	دو گارہ انٹرول	"
۶۸	رتنم چاری صاحب	اور سیر	۸۶	مولوی رکن الدین احمد صاحب	مسقف	بلدہ
۶۹	سری دھرم پورا صاحب	محاسب انجیر تھرا	۸۷	مولوی محمد افضل الدین صاحب	ایڈوکیٹ	"
۷۰	نارائن سوامی صاحب	اور سیر تھرا	۸۸	مولوی محمد عبداللہ صاحب	وکیل	"
۷۱	مولوی منظور الہی صاحب	سب انجیر تھرا	۸۹	ایم - اے - ال بی مولوی محمد سلطان صاحب	دو گارہ رفو قانیہ	بلدہ
۷۲	اردکیا سوامی صاحب	"	۹۰	فاضل مولوی محمد عبدالرؤف صاحب	ہسپتال	"
۷۳	مولوی عبدالغفور صاحب	ہڈ کلرک	۹۱	بی - اے - ال بی مولوی سید زبیر علی صاحب	وکیل	"
۷۴	شکر راو صاحب	سب انجیر تھرا	۹۲	مولوی رشید الدین صاحب	دو گارہ صوبہ دار	"
۷۵	گرد سوامی صاحب	"	۹۳	مولوی نہال احمد صاحب	ناظم عداوت	"
۷۶	دی - وی - ٹیٹی صاحب	"	۹۴			
۷۷	مولوی سید محمد تقی صاحب	اکریٹو انجیر تھرا				

۹۵	مولوی خواجہ نظام الدین صاحب	مصنف حالات	وزن محلی	۱۱۴	مولوی محمود عالم صاحب بی. ای	سنتی منجر بیوے	سکند آباد
۹۶	عبدالحق صاحب	تخصیص دار	"	"	بی. بیس سی	وکیل	نظام آباد
۹۷	احمد اللہ صاحب	ہستم تعلیمات	"	۱۱۵	محمد عبدالرحمن صاحب	وکیل	"
۹۸	محمد عبداللہ صاحب انصاری	دو گار نامہ تحریرت	"	۱۱۶	شرف الدین صاحب	"	"
۹۹	محمد نعمت اللہ صاحب	ہستم آبکاری	"	۱۱۷	سید زین الدین صاحب	ساجو	"
۱۰۰	سید محی الدین صاحب	دائیں پرنسپل کالج	"	۱۱۸	رام پرتاب صاحب	سامو	"
۱۰۱	فضل حسن صاحب	وکیل	آٹکنڈہ	۱۱۹	نرسا گور صاحب	"	"
۱۰۲	مرزا اشکو بیگ صاحب	"	"	۱۲۰	ذیل یڈی رنگا ریڈی صاحب	"	"
۱۰۳	سید محمد تہور صاحب	"	"	۱۲۱	محمد علی صاحب	گتہ دار	"
۱۰۴	سید معین الدین صاحب	"	"	۱۲۲	مولوی غلام احمد صاحب	وکیل	کلاڈہ
۱۰۵	مرزا عبدالرحمن بیگ صاحب	دو گار مست فوج	"	۱۲۳	محمد مختار علی خان صاحب	پرنسپل پولیس ٹرنگ	بلدہ
۱۰۶	سید محمد حسن صاحب بی. ای	وکیل	بلدہ	۱۲۴	تیج سی بیس	اسکول	"
۱۰۷	یل بی. بی	"	"	۱۲۵	نواب صاحب جنگ بہادر	رکن عدالت الہ آباد	"
۱۰۸	محمد کلیم الدین صاحب انصاری	"	"	"	ذلیفہ یاب	"	"
۱۰۹	بی. ای. ال. ال. بی	حکیم	"	۱۲۶	مولوی غلام حسین الدین صاحب	سب جسٹس	پربھنی
۱۰۸	حکیم محمد نظام الدین صاحب	اول تعلقہ دار ضلع	میدک	۱۲۷	جاگیر دار	"	"
۱۰۹	محمد جت اللہ شریف صاحب	"	بلدہ	۱۲۸	رام چندر راؤ صاحب	وکیل	"
۱۱۰	راجہ کرن پرنسپل صاحب	"	"	۱۲۹	پنڈت کندر راؤ صاحب	"	"
۱۱۱	بی. بی. ریڈی صاحب	پرنسپل فیصلہ	سکند آباد	۱۳۰	پنڈت راؤ صاحب	وکیل	"
۱۱۲	مولوی غلام محمد صاحب کورشی	نامہ علم آبکاری	بلدہ	۱۳۱	مولوی سید عبدالحی صاحب	"	"
۱۱۳	تیج سی. بیس	"	بلدہ	۱۳۲	میر یوسف الدین صاحب	ہستم کروڑگری	جانڈہ
۱۱۳	کرشنا چاری صاحب بی. ای	"	"	"	تیج سی. بیس	"	"
	ال. ال. بی	"	"	۱۳۳	مفتی علی صاحب	وکیل	مون آباد

۱۳۳	خار و من را و صاحب	دکین	سوی آباد	۱۵۶	مولوی سلطان محمد امین صاحب	سینٹری اسپیکر	سوی آباد
۱۳۴	شکر لال صاحب	"	"	۱۵۷	مولوی سید نور الدین صاحب	منصف	کودھل
۱۳۵	کشن را و صاحب میری	"	پرمی	۱۵۸	خواجہ محمد فیاض الدین خان صاحب	نائب ظم آبکاری	بلدہ
۱۳۶	بھاسکر را و صاحب ہزار کر	"	"	۱۵۹	خواجہ محمد حسین الدین خان صاحب	"	"
۱۳۷	مولوی عبد الحکیم صاحب ایم اے	صدر مدرس	بودمن	۱۶۰	مصل مولوی ہمایون صاحب بیربر	"	"
۱۳۸	مشتاق احمد صاحب بی اے	آزیر شریٹ لا	کریم نگر	۱۶۱	مولوی حمید حسین صاحب صدیقی	ناظم امور مذہبی	بلدہ
۱۳۹	آرکینو صاحب پیری	صدر مدرس فوقانیہ	"	"	خاص منصفیہ یاب	"	"
۱۴۰	مولوی سید ہدی حسین صاحب	مہتمم تعلیمات	پرمی	۱۶۲	غلام محمد صاحب	منصف	احمد پور
۱۴۱	خلیل اللہ شریف صاحب	دوم تعلقہ دار	نانڈیٹر	۱۶۳	ابوالقاسم سید محمد صاحب	صیغہ دار ہمدی مال	بلدہ
۱۴۲	محمد علی شریف صاحب	مہتمم آبکاری	"	۱۶۴	غلام محمد صاحب	مدد کار کو توالی	"
۱۴۳	منظر بیگ صاحب	مہتمم کتب دار ارمیہ	بلدہ	۱۶۵	محمد حسین صاحب	منصف	یلارڈی
۱۴۴	سری رنگ را و صاحب	دکین	پرمی	۱۶۶	ابو طیب محمد صاحب	"	مدیر
۱۴۵	مولوی فضل اللہ صاحب بی اے	مہتمم اردو کتب خانہ	بلدہ	۱۶۷	محمد علی صاحب ہوسوی	رکن مجلس مدنیہ	بلدہ
۱۴۶	مولوی ابو محمد صاحب	نائب ظم اعداد شمار	"	۱۶۸	ڈاکٹر ریاض الدین خان صاحب	اولی ڈاکٹر ہمدی	بلدہ
۱۴۷	سید یوسف صاحب پریس	مہتمم کٹی ہستوی	"	۱۶۹	ولایت علی صاحب	اسپیکر اتحادی	محبوب نگر
۱۴۸	لطیف احمد صاحب	پرنسپل مدرک طبابت	"	۱۷۰	سید محمد صاحب	مہاجر	"
۱۴۹	راجہ ہری پٹیا لکھن پور	دلی سستان	گرگشتہ	۱۷۱	محمد عمر صاحب	"	"
۱۵۰	مولوی سید خواجہ صاحب	ناظم سستان	"	۱۷۲	حبیب اللہ صاحب علمی	مدرس	"
۱۵۱	عطیہ صاحب	کھیل	کودھل	۱۷۳	منظف علی صاحب	اوسپر تعمیرات	"
۱۵۲	عبدالرزاق صاحب	"	کودھل	۱۷۴	محمد احمد صاحب خالہ دی	وکیل	گلبرگ
۱۵۳	محمد خیر الدین صاحب	"	بلدہ	۱۷۵	بہا الدین صاحب نظاری	منصف	سیلو
۱۵۴	قادر حسین خان صاحب ایم اے	نائب ظم کالج	"	۱۷۶	محمد ہادی را و صاحب	وکیل	"
۱۵۵	محمد عزیز الرحمن صاحب	بچہ راج کالج	اونگٹھ	۱۷۷	کشن را و صاحب	"	"

۱۷۸	دیوی داس باوصاب	وکیل	سیلو	۱۸۴	منتر صوفی پادشاہ بیگم	محلہ محبوبیہ گل سکول	بلدہ
۱۷۹	مولوی عبید اللہ احمد صاحب	انسپکٹر اتحادی	محبوب آباد	۱۸۵	مولوی یحییٰ محمد مرزا خان صاحب	"	"
۱۸۰	مرزا امجدی علی صاحب	پروفیسر عثمانیہ کالج	بلدہ	۱۸۶	محمد حیات خان صاحب	انسپکٹر آبکاری	"
۱۸۱	راجہ بہادر راجہ بشموناٹہ سنہا	رکن مجلس عالیہ عدالت	"	۱۸۷	عبدالرزاق صاحب	اڈویٹر کرورٹیری	گلبرگر
۱۸۲	مولوی غلام دیکر صاحب	لکچرار نظام کالج	"	۱۸۸	محمد منظر صاحب	سکرٹری کانفرنس	بلدہ
۱۸۳	احمد علی الدین صاحب	اڈویٹر مہاراجن	"	۱۸۹	مترن باوصاب	تحصیلدار باغیچہ	"

of leisure or unemployment which, if not properly tackled in time, threatens to overwhelm and even destroy the existing society and civilization. All problems affecting man, whether educational, social, economic or political, are inevitably inter-related. We have flirted too long with the policy of drift ; and I am extremely glad to note that the best brains in the State have combined to think of these problems, overhaul the present educaational system and give it a new orientation.

lished a chair for law and endowed fellowships for specialization and research.

Gentlemen, A great man of letters Carlyle has defined a lawyer as a "*loaded blunder-buss.*" Law is made daily almost hourly by the courts, the Legislature and the Executive and it is the duty of the lawyer to 'load' his brain with all these and to be a 'blunder-buss' when an opportunity presents itself before him. In other words I mean in plain language that a lawyer should be ready with his suggestions or advice in all spheres of life & at all time. It is the profession of law alone that has produced nearly every where in our country men of the highest intellectual calibre and the finest character-men who would have made their mark in any country. It has given us a number of Judges of high intellectual and moral gifts, whose work is a rich heritage, nor in any way less distinguished has been the work of many in the field of public affairs. The majority of politicians are lawyers. Lord Nelson has said that even the State is a 'legal order.' A civilized Government is distinguished from a barbarous or primitive one, among other things, by its ability and willingness to render to its citizens efficient, speedy, economical and equitable justice. After all truth and justice are the pillars of society according to the great dramatist Ibsen and those who interpret the one and administer the other are lawyers and judges. You should not only study law but also carefully study the lives of those great lawyers who have shed lustre on their profession. Their example should ever be before your eyes to encourage and enlighten you.

Gentlemen, A word more and I have done. As already observed every educational system rests on, and follows the social order and needs of the community concerned. Modern conditions have disturbed our ancient social order and destroyed the old institutions of the joint family and the hereditary professions, necessitating readjustment of society on a new basis. Moreover, modern civilization with its mechanical inventions has profoundly disturbed economic values and created undreamt-

of students to the Law College is foreign to the ideals of the legal profession. Like the republic of letters, the Legal profession has always been a republic and has ever held its portals open to every new comer who comes to try his fortune within its gates. But the misfortune of lawyers now lies in another direction. We forget the old saying that many are called but few are chosen. In England out of hundreds who are called to the Bar only a very few actually enter the profession, and out of even those who start practice, very many in a short period finding the prospects in the profession none too bright, either drift into or deliberately betake themselves to other callings or vocations. Some become journalists, others authors and playwrights, and some enter business or seek service either of the Government or private employers. But here in our country unfortunately the conditions are entirely different. Here we have a paucity of callings and few openings; the result is that once a lawyer always a lawyer, has become the order of the day. The consequence is that there is increasingly apparent the phenomenon of over-crowding with a falling off of standards all round, standards of comfort standards of professional etiquette and even standard of professional rectitude and it behoves the members of the profession to set things right and to preserve the dignity, honour, and integrity of the profession.

Another important aspect of legal education which I want to urge during the deliberations of this conference, is that provision should be made in the university for the study of legal education of an advanced type. I ask you to consider what after all is the out-put of our lawyers in the realm of law as a science? Are they devoting their attention to a study of comparative legislation or do they attempt at a study of the higher branches of law? What efforts are they making to press upon the attention of the University the great necessity for education of an advance type such as specialisation and research in certain branches of law? As the laws grow in bulk and complexity, the need for lawyers to specialize in their study will be felt more and more. I do not know if Osmania University has estab-

subjects. A great advantage of this scheme is that the Arts course will itself furnish the State with citizens imbued with general culture. What is wanted is not a mere accumulation of knowledge, but the development of the critical faculty and capacity to form sound judgments and for this purpose a study of law is, in my opinion, essential while at the same time general education should not be neglected. Writing in the eighteenth century Blackstone observed " I think it an undeniable position, that a competent knowledge of the law of that society in which we live, is the proper accomplishment of every gentleman and scholar; a highly useful, I had almost said, essential part of a liberal and polite education. And in this I am warranted by the example of ancient Rome where, as Cicero informs us, the very boys were obliged to learn the twelve tables by heart, as a *carmen necessarium*, or indispensable lesson, to imprint on their minds an early knowledge of the laws and constitution of their country." "Nothing which tends to raise man to a higher level is ever useless" In this connection I would specially advise my Jagirdar friends to take the study of law as a hobby and for general development.

But, gentlemen, while saying this you must permit me to draw your attention in particular to the 'mass production of law graduates' that is going on everywhere. The seductive charms of law as a profession attract far too many of our young men who do not take long to be disillusioned. It is, I fear, more easy to get into the profession than to get out of it. The number of appointments to which they can legitimately aspire is after all limited and the supply is more than the demand. This has led to 'over crowding' in the profession with the consequences of competition, underbidding and other like evils. This is a matter for the consideration of the profession as a whole and it is desirable that on this important question the members of the profession organised in their various organisations should pronounce a well considered opinion. Speaking for myself I have always held and even now hold the view that a restriction at the time of admission

Further a two year course for legal Education is, I am afraid wholly inadequate and the length of the course should be at least three years. Again there must be intimate connection established, between the Faculty of law and the University authorities on one hand, and the Bar Council if one is constituted and the High Court on the other, the latter undertaking also to provide for some practical education. There should also be provision of adequate libraries for the use of students.

The reforms that I would suggest are that our University should liberalize legal education, revise their curricula lengthen their term of study and provide more adequate libraries. I would also suggest that a Council of Legal Education should be created consisting of representatives of (a) Professors of Law and Civics (b) some Judges and (c) some eminent lawyers whose function must be to regulate higher legal education.

Gentleman,

It is also highly desirable that the average man should know something of the general principles of the law under which he lives and on which he is dependent for the carrying on of everyday existence. "Ignorantia juris non excusat." That ignorance of law is no excuse is a trite maxim. Even of more importance, however, to the cause of good citizenship than a knowledge of the elementary principles of law, is a just appreciation of its spirit and function, the ends it is designed to serve and the relations subsisting between it and the administration on the one hand and between it and morality on the other.

Hence I wish to stress the importance of law as a valuable subject to be studied in a general scheme of liberal education. The Universities of Oxford and Cambridge have provided for the study of law in the faculty of Arts bearing in mind that the aim of education is to give a cultural outlook. Why should not our University do the same and include some of the subjects of law such as General Jurisprudence, Elements of Roman Law and Constitutional Law as optional

needs. The 'practical' lawyer of to-day is not all-sufficient. The State and the courts are now concerned with great social and political experiment and so the law schools must aim at shaping the minds of their students towards critical understanding of the foundations of jurisprudence. It is often regarded, though erroneously, that law is merely a collection of rules and precedents.

The aim of all legal education ought to be to 'produce lawyers, not merely for recruitment to the Bar and the Bench but something more. The proper method must aim at producing not only men who want to adopt professional work as the main occupation of their lives but also men who would like to devote themselves to legal authorship. Attempts should be made to teach Conveyancing, Drafting and Pleadings. The object of Universities ought not to be merely to produce graduates in law so that they may join legal profession or secure some Government appointment. This I think is wholly inconsistent with the ideals of university education in a cultural subject such as law. Judged therefore by the standards of legal culture and scholarship the legal education which is imparted ought not to be of a narrow and limited character. For a practitioner in a court of law no doubt it is necessary that he should have an accurate idea of the Statute law and Case-law, but I think that if legal education has, as it must, for its object the broadening of a man's mind and of enabling him to contribute to the development of legal ideas or the correlating of law to the social-logical needs of the country, then it is a question for us to consider whether the legal education which is at present being imparted to our graduates comes up to the necessary standard. There are subjects such as Constitutional Law, Private International Law; Public International Law, Industrial Law, Company Law which are of growing importance and which are bound to assume greater importance in the years to come and I propose that provision is made in our university for the teaching of these important and valuable legal subjects,

stable, while societies are progressive and the happiness of a people depends more or less on the degree of promptitude with which law is made to adapt itself to the changing conditions of society. Law should be brought into harmony with society. In these days our society is confronted with many problems in the social sphere as also in the sphere of labour, capital, banking and currency and commerce and industry. In the political sphere we may say that this is the age of constitution making. All the civilised states have embarked upon a policy of reforming their systems of Government to suit the changing times. Law is a product of social forces and it is the bounden duty of lawyers to establish a close connection between legislation and the dominant trends of public opinion in the many spheres of our national life

Law is a social growth as well as a social necessary. Therefore, I plead that the lawyer should realise his responsibilities as the custodian of the honour, rights and liberties of the people amongst whom he lives.

I will now proceed to say a few words on the question as to whether the legal education that is imparted in our law colleges is sufficient to equip the lawyer to effectually discharge the functions that are expected of him. The curricula and the course of studies ought to be broad and liberal enough so as to make him thoroughly acquainted with the problems that confront society and to suggest adequate solutions therefor. It is from such an aspect that I want to take a critical view of the system of legal education as is imparted at the present time.

We are now on the threshold of an epoch of profound legal transformation. Our educational methods have to create a race of lawyers able to utilise the spirit of law reform for the highest uses. They have to reach the importance at once of stability and change on proper lines. We must turn out lawyers with a courage to be critical, to be constructive about what is necessary for new situations, new development and new

SOME ASPECTS OF LEGAL EDUCATION

Lecture delivered by Dewan Bahdur
S. Aravamudu Aiyangar

Mr. President Ladies and Gentlemen,

Law has always been an important branch of study in the sphere of education and it is one of the learned professions which attracts a large number of our young men every year. There has been reform and reconstruction in many other branches of study but in regard to legal education lawyers of Hyderabad have not yet considered the question of adjusting the system according to the changing needs of the times. Today I want to discuss certain important aspects of legal education rather than consider the manifold problems arising out of the legal systems in different countries.

It is a well known maxim that the rule of law is the condition of liberty. The true function of law is to remove the obstacles which injustice and oppression of any kind put in the way of free development. Amid the cross-currents and shifting sands of public life the law is like a great rock upon which a man may set his foot and be safe. In these times of storm and stress, every citizen ought to be able to feel that in the law courts at any rate he can get justice. Law is a product of human reason or systematised commonsense and law is justice. Therefore it ought to be both the ambition as well as the duty of lawyers *to serve the State* and protect the rights of their fellow men. A fearless judiciary and a vigilant bar are necessary to safeguard the lives and liberties of the people of a State.

But the question may be asked, how could lawyers serve the State? Lawyers have always been the leaders of society and there is ample scope for their work in all countries at the present time. First and foremost we find that societies have been progressive and here it is to be pointed out that society and public opinion are always more or less in advance of law. Law is

bear the entire burden. Many people build beautiful houses in the best localities and find they cannot afford to live in them themselves and so are forced to rent them to others. It would be more to their interest if they directed their finance and ideas to erecting buildings to school plans and requirements. They would then be sure of a regular income from Government. There is surely no lack of financiers in this city and if they would co-operate with Government for the building of properly planned school houses they would be helping themselves, their children and their state. At the moment one Middle School house of this kind is in progress and there is every hope of it being a 1st rate building.

is quite deafening and nerve racking. On account of the constant din, darkness or extrem glare, and viciated atmosphere; children must lose their finer senses of sight and hearing and become partially deaf and blind - no wonder they look dazed till they are taken out into the fresh air under the shade of the one and only useful tree. Even there, they must play games requiring effort and skill and do Gymnastics on hard uneven stoney ground. On a wet day all ideas of physical work must perforce be abandoned. At meal time every available floor space, whether it be a thoroughfare or not is dotted with dusterkans and Mammas sitting and driving flies. I am sure more time is spent trying to be rid of the flies than eating. Morning assembly is conducted in whatever open space there is. Think of small children of 4 and 5 years of age standing in the heat of the Sun while 100, 150, 200 or 300 girls walk out and line up. This need not be the tedious affair it is if there was a large hall with many entrances and exists. The whole school could assemble and dismiss simultaneously in a few minutes. Over crowding is the cause of inattention, bad discipline, disorder bad habits and unhealthy children and staff.

Now in all fairness to the authorities of the Educational Department, I must admit that during my almost three years of personal experience and contact with these schools I have seen efforts towards improvements and definate improvements have been achieved. Several schools have moved to better premises. They have forfeited class room space for providing clean dinning rooms. The buildings have been generally cleaned and where possible sanitation has been corrected. Besides this the furniture of some has been renovated and and Hyginically remodelled. The authorities are not blind to the faults and failings which have been enumerated. They would do much more and have ideal schools were they not tied down by lack of money and need of understanding and cooperation from the public. Parents could help by sympathetic and intelligent response to school demands. They could work harder and live within their means and pay more for the education of their children instead of demanding Government to

use they are intended for. They should be connected yet shut off from one another by corridors or verandahs. The entire building should stand in spacious grounds allowing for school gardens, an all weather play ground of moderate size, open grounds for net ball, Tennis, Badminton, and Tennicoit Courts and a running track for athletics. Part of the grounds should be reserved exclusively for the coming and going of School conveyances suitable to Purdah requirements. This type of school building is without a shadow of doubt conducive to good health and simplifies and makes practicable the disciplinary habits of cleanliness, and order and will also develop a sense of beauty and good taste. In the calm and quiet of which children and teachers could give their best attention to teaching and learning.

In contrast most of the buildings in use are situated in unhealthy localities. The approach to them generally being long narrow gullies serving the purpose of cesspool and handy latrine for passers by. The buildings themselves are ancient in construction, highly ornamental and difficult to keep clean. Or worse still, falling to pieces in places with sinking roofs, curved floors, steep, narrow, dangerously rotten stair cases dark unventilated pigeon coops for rooms, useless dailans, ornamented with numerous pillars. Their lavatories are of the worse and most unhygienic type usually inside the building or adjacent to the class rooms and court yard. The drains if any are more often than not in a state of disgorging their contents instead of carrying it off swiftly. The picture would be incomplete without the stagnant green pond which in the light of other better days might have had a fountain playing in it. The size, lighting and ventilation of the places used as class rooms are quite unsuitable for the number of children accommodated in them. In fact it is a marvel to me how children can be educated against such odds. The incorrect lighting is enough to ruin their sight and the noise from the surrounding class rooms or from children at play plus the Mamas shrieking at each other

Speech delivered by Miss M. M. SHAW

in seconding resolution No. 12.

Mr. Chairman-Ladies and gentleman: I thank you for the opportunity you have afforded me of supporting the resolution, that in the opinion of this house it is necessary that all buildings, used for schools and particularly girl's Schools in the Dominions of His Exalted Highness The Nizam; should provide adequate space for well ventilated class rooms, dining rooms and play grounds. I do so with much pleasure because once this resolution materialises, my work in the scheme of education i. e. Physical Education, will be definately benefited and its far reaching effects will not be hampered by visciated atmospher in class rooms, in-sufficient space, meagre and unsafe playing grounds.

I would first like to give you an idea of a standard school building providing all requirements to further and fascilitate a well balanced practical education. To start with it should be as far as possible situated in a clean locality. Its construction should be non-ornamental and simple, yet solid and impressive; containing a room for each class of the school and separate rooms for subject teaching such as Geography, History, Science, Cooking, Domestic Science and Art. It should provide a general reading room, rest room, for staff, a sick room for the children and office for the Head Mistress and an assembly hall which could also serve the purpose of a Gymnisum. Its dining rooms should be large and airy to comfortably seat the entire school and its Sanitary Lavatories should be correctly situated apart from the main building but connected by a covered passage. They should be bright, airy and clean. The floor concrete and walls glaized or tiled the minium numbler of water closets being 1 for every 20 children.

The size ventilation and lighting of all the rooms depend upon the number of children they are to accomodate and the

Schiller's ideas then aim at restoring a totality Man, Kant had said, is a citizen of two worlds, one of the senses (Mundus Sensibilis) the other of the reason (Mundus Intellegibilis). It is beauty, says Schiller, where both these worlds are reconciled.

Are we to conclude in the optimistic vein in which Leibnitz concluded his great work on Human understanding *Nouveaux Essays*. "We must need reform in a good many things the present state of literature and the education of youth and consequently of the police. And when I consider how far man has advanced in knowledge since a century or two ago, and how easy it would be to go further in making him happy, I do not give up the hope of being able to bring considerable changes in more tranquil times, under the guidance of some great prince whom God may create for the good of man." No less sanguine was the idealism of Fichte and He-gel. But, as it is, the world does not move according to the heart's desire of a philosopher. War is knocking at our doors. Chaos reigns around. May be an æsthetic education which has as its goal the unity of thought and feeling would save Mankind from that abyss of destruction into which it is otherwise doomed to fall.

veries and the free association of ideas have in themselves that freedom which is characteristic of æsthetic play, though in this case only a freedom of material art. Another step and we play with beauty. "If it is need which forces man into society and the reason which endows him with social maxims, beauty alone can invest him with social character. Only taste can bring harmony into society, while it sets up harmony in the individual. All other forms of ideas separate man, while they establish themselves exclusively on the sensual or on the spiritual part of his being. Only the beautiful idea makes a whole of him where both these natures harmonise. All other forms of expression separate society, while they rest on the private receptivity of certain parts, or in otherwords they have to do with what differentiates man and man. Only beautiful expressions unite society when it conforms to what is common to all. The pleasures of the senses we enjoy as individuals, the species which we are participating therein. We cannot therefore universalise our sensual pleasure, while we cannot make our individuality a universal. The pleasure of knowledge we enjoy only as species, and so far we set aside assiduously every trace of individuality from our judgments. We cannot therefore make the joys of reason universal, while we cannot eliminate the traces of individuality from the judgment of others as from ours. Only the beautiful we enjoy both as species and individual, i.e., as representatives of the species. The good of the senses can make one happy while it rests on appropriation and exclusion. It can make one happy one-sidedly, for the personality does not take part in it. The absolute good can make us happy under condition which cannot be supposed universally. Truth is the reward of self denial, and in the purity of will only a pure heart believes. It is beauty only which blesses the whole world, and every being forgets its limitations as long as it feels its charm."

It is therefore in the interest of culture that a sense of beauty should grow in us and free us from the shackles both of the senses and of reason. The primitive mind pleases itself on what it touches with the senses, or in other words, on the brute reality of facts. It has not yet gained a feeling for what simply appears. But beauty is only in the ideal, in appearance not in reality. We have to enjoy the beautiful without asking why it is so, without having recourse to the category of purpose. The world of beauty is the world of play. We see animals play. Why do they? The psychologists have ventured different and highly doubtful answers. Schiller sees here already that freedom from compulsion which terminates in the æsthetic play of man. "Indeed nature has raised even the irrational brutes above physical needs and has inflamed the spark of freedom in the dark life of the brute. At a time when no hunger torments the lion and no animal challenges him to fight, leisurely strength creates its own object; with an audacious roar he fills the echoing woods and without purpose his overflowing energy expends itself. The insect enjoys life in sunshine, and certainly it is not the cry of passion which we find in the melodies of the singing birds. Undeniable is freedom in their movements but not a freedom from desires as a whole, freedom only from particular needs. An animal works when physical deficiency goads it to activity, and it plays when it is the overflow of energy which is the stimulus, when the over-abundance of life becomes an incentive to its own activity. Even in lifeless nature there shows itself such an abundance of energy and laxity of determination as may well be called play in the material sense. The tree gives numerous seeds which die undeveloped, and shoots forth many more roots and branches and leaves than can be made use of for the preservation of itself and its species. We find ourselves already in the freedom of movements which is its own purpose and already in the realm of matter we have a foretaste of the unlimited and infinite. Re-

his nature with the highest and the lowest, and if his dignity rests on the strict distinction of one from the other, so rests his happiness on the lifting up of a like difference. The culture which has to bring into harmony his dignity and happiness will also have to see for the preservation of both principles in their unity." It is here that reason makes its appearance for the first time. It is the function of reason to raise man from the immediacy of the present to the realm of eternal ideas. But by a curious misunderstanding reason instead of raising itself to the eternal makes endless all desires and passions, all needs and wants. "The first fruits which a man earns in the world of spirit are anxiety and fear; both are the results of reason, not of sensuality, but a reason which misses its object." In the end it comes to the same whether man is ruled by reason or by the senses. In the first place he is an irrational animal, in the second rational one. He ought to be neither infact. Nature should not rule him exclusively and the reason should not control him conditionally.

Schiller examines the question of beauty and knowledge. Wherever there is a question of knowledge, thought and feelings stand apart. Feeling associates with thought as something accidental. Beauty on the otherhand rests on the synthesis of activity and passivity, of thought and feeling, "We need not therefore be at a loss to find a transitional stage between the dependence of the senses and moral freedom, when in beauty we find that the first can exist with the last." The Romantic School which followed Schiller and advocated the independent claims of feelings in the face of onesided domination of reason has its forerunner already in Schiller. Unfortunately even today psychologists show a deep ignorance of the emotional depth of men, and their usual division of feeling into pleasure and pain is highly questionable.

Or it can relate itself to our understanding and can impart knowledge to us; this is its logical quality. Or it can relate to our will and can be regarded as an object of choice for our reasonable being; this is its moral quality. Or lastly it can relate itself to the totality of our manifold powers, without being an object for any of them; this is its aesthetic quality. A man can be agreeable to us in his readiness for service, he can make us think through his conversation; he can inspire us with respect through his character; and lastly, independent of all these, and without our taking into account in judgment any law or purpose, he can please us in his contemplation and in the way he appears to us. In this last quality only do we judge him aesthetically. There is then an education of health, an education of insight and education of morals, and an education of taste and beauty. This last has for its purpose the cultivation of our whole sensory and spiritual powers in the most possible harmony.

For Schiller there is firstly a state of man when beauty has not yet begun to work. Man is only a slave of needs and desires. "In this epoch the world is only fate (i. e., something unalterably given for him) not yet an object. All has an existence for him so far as it makes possible his existence; what does not give anything nor take anything from him is not at all present to him." He sees in all wealth and luxury of the world only something to exploit, and in its majesty only an enemy. This is the primitive condition of man when he is not yet chastened by beauty. He lives in the present and is isolated there. He is indifferent to the dignity of others. "Man, we can say, was at no time in such a condition of brutes, but he has not yet also extricated himself therefrom. Even in the most uncultivated subjects we find undeniable traces of rational freedom, as in the most cultured, there are moments which remind us of that dark period of nature. It is peculiar to man to unite in

of the ideals which bestirred their souls. It was for Holderlin to give later the most passionate and tragic expression to this attachment and passion for Greece. What was it that so fascinated the humanists and the romantic poets of the early 19th Century in the land of Plato and Homer? The Greeks saw above all a harmony every where and their educational ideals they hoped would produce alike harmony in the soul. It was not in parts but in the whole that their spiritual metaphysics centred. Not in multiplicity and division, but it was on the unity which supersedes them that the seemingly antagonistic schools of Plato and Aristotle laid stress. It was reserved for Hegel to give a most systematic and comprehensive expression to this feeling of unity, which not only replaces manifoldness but transcends, it. The truth is that the whole education then must conform with the metaphysical structure of the soul and the world. What else but unity and harmony has it to aim at? Throughout Schiller raises his voice against the superficial utilitarianism which is the bane of modern life. Culture, as he understands it, does not culminate in making man happy or practical but it stands quite indifferent to these aims. The philosopher who most effectively banished the notion of utility from the domain of Ethics, Kant, was of the opinion that it was not happiness as such that man should hanker after, but that he should rather prepare himself to deserve happiness. Schiller while giving full justice to the demands of reason, saw in culture the reconciliation of the senses and reason. But the world of facts and experience shows us men either in a state of tension or in a state of relaxation. It is for beauty to restore harmony in tension, and energy in relaxation.

All things which appear can be considered in one of the four relations. A thing can relate itself to our sensual conditions (i.e. our being or well being); this is its physical quality.

material instincts is life in its widest sense, which includes all materiality and all that which is presented immediately through the senses. The formal instinct has as its object what may be called form,—that is all the formal qualities of things and their relation to the power of thought. The instinct of play refers then neither to form simply; nor to life simply, but to the form which is pregnant with life. "A block of marble, though lifeless and remaining so, can still become a living form by will of the architect or the sculptor. A man though he lives as a form, is not therefore a living form. For that it is necessary that his form should be life and his life should be form. So long as we think only of his form, it is lifeless, a simple abstraction; so long as we feel its life, it is formless, mere impression. Only so far as its form lives in sensation and its life forms itself in our understanding, is it a living form, and this will be the case whenever we judge it as beautiful."

Schiller himself anticipates the doubt which might rise in many of us, the doubt namely, that to think of beauty as object of play does not conform with the dignity of beauty, which is after all taken to be the instrument, and the only instrument, of culture. To confine it to the beautiful contradicts at the same time the general notion of play. "Of course we should not think of the plays which are in vogue in real life and which are directed to some material object but in real life we seek in vain the beauty which we desire.....When the Greeks amused themselves in the Olympic tournaments, a bloodless competition of power, alacrity and on the nobler competitions; and when the Romans enjoyed themselves in the deadly struggle of gladiators or their Lybian enemies it becomes clear of itself why we should seek the ideal form of a Venus, a Juno, an Apollo not in Rome but in Greece...In a word man should play with beauty and with that only." The whole structure of Schiller's thought owes much to the Greek Ideals of culture, and no less than his friend Goethe, he sees in ancient Greece the highest realisation

both. Neither the exaggerated development of feelings and emotions would be allowed to lead us to empty enthusiasm, nor would the rational faculty be given the liberty of encroaching on the other's territory. "In a word, material drive needs control the personality, and the formal drive the receptivity, in their proper confines."

These philosophical reflections led Schiller to expound a remarkable theory of play. It must be noted that Schiller's theory is not to be confused with those empirical theories, Spencer's for example, which find so much favour among psychologists today. The instinct of play, says Schiller, is that via media we have been seeking all along the course of our enquiry. It is the unity and reconciliation of both these "drives." The material instinct excludes from its object all self activity and freedom. The formal instinct excludes from its object all dependence and suffering. The exclusion of freedom is the physical, the exclusion of passivity is the moral necessity. Both these instincts compel the spirit (Gemut) : that through the laws of nature, this through the laws of reason. The instinct of play, where both of them work in co-operation, frees the spirit (Gemut) morally and physically at the same time. While it lifts up all contingencies it will also set aside all necessity, and bring freedom to Man, morally and physically. "When we passionately cling to a man who is worthy of our contempt, we painfully feel the compulsion of nature. When inimical towards another whom we are forced to give our respect, we painfully feel the compulsion of reason. But the moment he interests simultaneously our inclination and wins our respect, then vanishes the compulsion of senses as well as that of conscience, and we begin to love him, i.e. we play as well with our inclination as with our respect."

Schiller enquires into the objects of the two fundamental instincts which he elaborates in detail. The object of the

kind exhausts itself. The Material instinct demands change indeed but not a change of person. The formal instinct directs itself to unity and permanance but only so far as the personality is concerned. It leaves untouched the conditions. Says Schiller, "So soon as an original, that is necessary, antagonism of both the instincts is maintained, there is then no other means of bringing unity to be conceived than the subordination of the sensual drive to the rational. There can only result uniformity but no harmony, and man remains divided for ever. There needs be a subordination, though a reciprocal one. Both principles are to be subordinated and coordinated. They stand in reciprocal action; no matter without form, no form without matter. It is the educational problem pre-eminently to bring both of these urges into anequilibrium. Education must see to it that the senses are protected against the onslaught of freedom, and secondly it must assure the person against the power of the senses. "The former it attains through the cultivation of the emotional faculties; the latter through the building up of rational power. The highest possible passivity and receptivity of the emotional and the utmost development of the activity of the reason are really indispensable conditions of a true culture."

Schiller's thought then aims at bringing about such a harmony in man as can be conceived in his ideal possibility. You must note that he lived at a time when there was heard much of humanity and humanism. His own countryman Herder was its prophet. No wonder Schiller refers again and again to the Idea of man or to Ideal Mankind. The Idea, as used in the transcendental sense of Kant and Schiller, is that trans-empirical ideal 'intended' or aimed at by reason but never found in reality and experience. It is only its approximation that we come across. The idea of man then comprehends a synthetic unity of both these seemingly contradictory tendencies. The culture we are in quest of gives justice to

and dignity. It is in beauty of character that all educational reforms should end.

There are two fundamental "drives" or instincts of man, says Schiller, one aiming at matter, the other at form. To quote his own words, "The first of these instincts, which I would call material instinct, has its origin in the physical being of man or in his sensual nature, and is engaged in placing him in the conditions of time and in making of him matter....Matter means here nothing but change or the reality which fills up time. Thus the material instinct demands that there should be a change that time should have some content. This condition of merely filled-up time is sensation; it is this alone through which the physical being lets itself be known." The second of these instincts has its source in the infinite of man. It aims at his freedom, it aims at harmonising the diversity of his appearances, and at the assertion of his person in the multiplicity of his conditions; it sets aside time and change. It demands that the real be necessary and eternal, and the eternal or necessary to be real. Universality is its characteristic. The inclination can merely say—this is good for the individual and for your present, but your individuality and your present need might change, and what you eagerly desire at present might become the object of your disgust. But when the moral feeling tells us it ought to be so, it so decides it for ever. When you—confess truth while it is truth and practice justice while it is justice, you have made a singular case a Law for all others, treated a moment in your life as an eternity. In fine where we are ruled by this instinct there vanish all limits and we are transformed from a numerical unity in an ideal unity. We are no more in time but time is in us.

In spite of the apparent contradictions of these two tendencies which banish all hope of reconciliations from our minds, it is in their joint—operations that the concept of man—

reme and the senses are suppressed, forces our respect but does not win our love. The culture we are after seeks a beautiful soul with whom duty becomes an inclination. "The beautiful soul has no other merit than that it exists." And further, "When the conscience-stricken man lives in eternal fear lest he should meet the law-giver in himself or in the world outside, and sees in all that is grand, beautiful and excellent an enemy, the beautiful soul knows no sweeter happiness than that the Holy in her should be imitated or realised without, and see in the world of senses an undying friend." Grace is the expression of such a harmonious soul in the world of appearances. Dignity on the other hand is a manifestation of a sublime character which has to struggle against the avalanche of the senses. It is dignity which protects love from falling into desire. It is love which sees to it that respect does not become fear. Dignity and grace however need not deny each other. We see the co-operation and the successive working of both these principles when we are brought under the spell of some really great work of art. "Irresistably fascinated and attracted by the one, kept at a distance by the other, we find ourselves in the condition of the highest peace and the highest agitation, and there results that wonderful feeling for which understanding has no concept and the language has no name".

Schiller's whole concept of education and culture then really aims at bringing such a beauty into the human soul that all its contradictions vanish, and all its antitheses reconcile themselves, and harmony of the different chords of being takes its place. His cultural philosophy goes to generate that 'entente cordiale' between the limited and unlimited, which for him is culture. Neither should man be absorbed in the sensual pleasure of the present, and be wild and unres-trained, nor should he be a slave of maxims or a barbarian, but a living synthesis of grace

imagination, was a most limited one.

Schiller's philosophy, though so modest in its aims, is a happy development of the ideas of his master, Immanuel Kant. We cannot, therefore, easily grasp the motives of Schiller's thoughts, nor understand the working of his mind nor sympathise with his struggle against the rigidity of rational thinking, unless we examine in some detail the critical philosophy. For Kant and Schiller knowledge (Wissen) is limited to the phenomenal; the supra-phenomenal realities elude it. Again, for both of them reason (Vernunft) transcends the realm of sensibility and aims at ideas. Freedom, which is a postulate of practical reason and which implies a spontaneity and power of self initiation of an act free from any causal check, is a feature of rational life in contradistinction to its empirical manifestation. Nature and freedom are the two extremes between which we are suspended. Is there any link possible which can bridge the gulf between nature and freedom? Kant, in one of the most memorable books in the history of philosophy, the Critique of judgment, has examined the question. It is just the point where Schiller's philosophical thought develops and provides the all-too needed corrective to the Kantian system, and especially to his Ethics. For Kant inclination and duty are the two extremes which refuse persistently any reconciliation. Our senses drive us to hunt for pleasures. It is for reason to come to the salvation of our being and raise it from the world of senses, to the world of intelligence. It is culture, says Schiller, where such a reconciliation is possible. With the unerring—intuition of a poet he draws a remarkable distinction between the dignity and beauty of human character. We can say that Kant had in mind only the dignity of character. The notion of a beautiful soul has just escaped his notice. Kant proceeds as if the categorical imperative of the duty and the forces of inclination were by their very nature irreconcilable. A character which is thus in constant war against itself, where Reason reigns sup-

than in the development of educational theories. It was characteristic of an older generation to see purpose or form even in the inorganic world; whereas the present generation pretends to see in physico-chemical activity the ultimate ground, and in the natural sciences a pattern for all other sciences. To Wilhelm Dilthey belongs the credit of protesting sharply against the validity of the explanatory method of the natural sciences in psychology. Dilthey in his deservedly famous paper contrasts the two methods of approach in the psychological field, explanatory method of the natural sciences, and the method of "understanding." An intelligent understanding of the process or of the figures of history is the only valid method in psychology. In other words, psychology can never be a science like other sciences employing their categories and following servilely their path of mechanical explanation. It can only be a science like history. Happily we now see a transformation going on in the very cradle of the mechanical sciences.

Where is the thinker who can guide us in our search after higher ideals, who can be a link between the ancients and the moderns, neither so thoroughgoing a rationalist as to lose himself in the quagmire of speculation, nor such a visionary as to vanish in the realm of fancy? In the person of Friedrich Schiller we find the poet - philosopher we are seeking. His valuable and provocative ideas about education and culture show German Idealism at its best.

Schiller, (1759-1805) who is generally known to the world at large as a remarkable dramatist, a friend and contemporary of Goethe, and to the German children as a writer of beautiful ballads, was at the same time a student of philosophy. He has given expression to his thoughts in some very remarkable essays which are called by Hermann Lotze the jewel of German Literature. But Schiller was not a system-builder in any sense, and his philosophy, if it can be called a system by any stretch of

world over our race is passing through difficult times. The present century, though advanced mechanically, has not gained in that speculative acuity and spiritual depth which characterised some centuries of the past. On the contrary we have seen strange symptoms of inner chaos. Behaviorism in psychology which denies the very foundation of the science, Pragmatism in philosophy, which pretending to be a theory of truth denies truth itself,—what can these mean but dangerous symptoms of the disintegration of our culture? It is now high time that all these fads should cease, and a new orientation be given to culture and education. I do not take the question of education only from the point of view of the individual. Society and State are also to be reformed. Let us free ourselves from the superficial notions of education which we see current around us and enquire into the very nature of culture and civilisation. Our system of education is senseless, because it does not even pretend to guide and mould the world of the individual in its totality. The mystics of old asked and speculated about the destiny of Man in the whole cosmic process. We as educationists have to ask about the mission of Man in this life, how to make of him a happy father of a family, a worthy citizen of a State and a zealous devotee of the Supreme.

Gentlemen, the most unfortunate result of mechanical progress and the hegemony of natural sciences has been neglect, nay, even contempt for philosophical discipline. He who has studied in earnest the history of educational ideas knows what tremendous role philosophical notions have played and what impetus they have given to the culture and civilisation. The very names of Plato, Rousseau, Fichte, Herbart, Pestalozzi and others are sufficient to bring before us the significance of humaner pursuits. We are seriously labouring under the illusion that natural sciences which deal with only a superficial cross section of the realm of knowledge, will provide us the categories to explain the whole. Nowhere is this illusion more dangerous

SCHILLER'S PHILOSOPHY OF EDUCATION AND CULTURE

By Dr. SYED VAHIDUDDIN Ph. D.

Mr. President and gentlemen:— Thanks to the growth of political sentiment in the country, the problem of education has taken a new turn and efforts are being made to re-adapt our educational system to our changing needs. But in our zeal to give a practical and industrial bias to our education we are apt to forget that disinterested pursuits are really the backbone of civilisation and that ignorance of spiritual values might be fatal to our dreams of an Indian renaissance. Our country has always been famous for deep spirituality, a keen sense of the Divine and a contemplative attitude towards life. Whether this psychological structure of our existence is to be held responsible for the political lethargy from which we are gradually waking up, is a question I leave apart. I am concerned only to show that the once reputed metaphysical bent of the Indian mind has now given way to an empirical and almost naturalistic outlook, which is partly the result of the deep-rooted changes that the mechanical discoveries of the last century have brought into the general consciousness of civilised humanity, and have all of a sudden counterbalanced the philosophical world of the ancient masters, say that of Aristotle or St. Thomas; and partly it is due to the unimaginative system of education which has sadly affected that growth of spiritual factors, ignored the emotional life of the individual and confined itself to the barren study of a foreign language and culture. A new Shankara is yet to be born to remind us of the unity of all, and a new Rumi to sing of love which must precede any such vision. Not only in India but all the

other country. May God Almighty grant him success in every enterprise and victory in every field of action ; keep the Princes and all the members of the Royal family happy and inspire us and our descendants to remain ever loyal subjects of the Asafiah Dynasty.

mental research by men who are unconnected with a government laboratory or observatory, but whose scientific studies and devotion to research do not allow them to sit idle. If such an institution is started I shall be delighted to serve on its staff absolutely without remuneration and train and guide promising young men in the principles of research. Scientific investigation is impossible without a well-equipped laboratory or observatory, otherwise a lot of work would have been done here already.

Idara -i- Adabiyate Urdu whose Editor and Fellows were among the best students of the Osmania University College when I was its Principal, and have now acquired recognition all over India through their literary activities, are rendering valuable service to the cause of Urdu Literature in the country, with their own finances and a little outside pecuniary help—as may be gathered from a perusal of its publications. I have not referred to the excellent work done by the Dairat-ul-Ma'arif and the Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu in this connection as they are almost entirely financed by H. E. H's government. I wish our wealthier and more influential citizens will come forward to start an Institute of Scientific Research and bring Hyderabad to the fore-front in this important line as well. There is no lack of problems for solution to a busy brain; and approved experience and prolonged enterprise can never fail in their attempts, if they take up any work, free from obstructions.

In closing this address I pray for the long life and prosperity of our benign sovereign, H. E. H. the Nizam of Hyderabad and Berar, Nawab Mir Osman Ali Khan Bahadur, under whose gracious rule millions of people professing every conceivable creed and religion enjoy not only a life of perfect peace and tranquillity, but of every possible ease and comfort. During his prosperous reign the country has made such rapid progress in Education and works of public welfare that it is difficult to find a parallel in any

object is through the agency of books of the right type. Carlyle's famous remark, that books constitute the real universities of the world, has never held so true as in the present generation.

It is hoped that the most important library in Hyderabad—The State or Asafiah Library—will continue to conform to its established traditions and guide the public along the right path. Similar libraries should be established in the districts to release people from the clutches of communal literature and derive benefit from perusal of books advocating union and mutual trust among mankind. I recommend these libraries to be founded by public subscription, the State also contributing something towards their upkeep.

Apart from help in adult education, public enterprise can be most advantageously employed for advanced research as well. The Indian Association for Cultivation of Science, Culcutta, is an institution started and maintained by public donation. It laid the foundation practically of organized experimental research by Indian Scientists in India. Previous to its installation, the laboratories of government Science colleges rarely attempted to train students beyond the limits of ordinary university examinations. They had no means of equipping themselves with Scientific apparatus and other requisites necessary for systematic research. Philanthropic people interested in Science got up an adequate sum by subscription and placed its income at the disposal of competent investigators to work on their particular problems of research. The project turned out to be most successful in a very short time. As a matter of fact, some of the very first investigations of an original character made by Indian Scientists in India, were conducted at this institution, and were introduced to the Scientific world through publication in its Journal. If enthusiastic rich men in Hyderabad were to make up their minds to start a similar association in the State it would be easily accomplished, and would provide facilities for experi-

papers and Journals. These books constitute the best produce of current times from the points of view of comprehensiveness, clarity, accuracy of expression and reasonable cheapness. This is not the age for whiling away time by reading passionate romances, detective stories and accounts of accomplished criminals. For this very reason the best writers do not waste their talents on works of this description. Science and Philosophy which up till recently kept aloof from each other, as if confined to water-tight compartments, and one was supposed to begin where the other stopped, are now endeavouring to walk, so to say, hand in hand, under the influence of modern experimental research and observational experience. What wonder that in the next 25 or 50 years they will merge into each other to form one and the same branch of knowledge. Some of the best brains of the world are nowadays exercising their talents to achieve this object. History, which was written in bygone days to proclaim the glories of an individual nation or country, is found now to aim at the sifting of truth and arriving at impartial decisions; and above all, not only to thwart completely the attempts of war-like races and their war-minded statesmen to sow seeds of discord among various nations, but to bring them together by invoking the aid of universal laws of Science and Philosophy. Let us hope that peoples of all nations will imbibe these ideas freely, and under their influence, exert their own moral force to save the world from that catastrophe which is threatening to swallow it up by the abuse of inventions based on the pure and truthful laws of Science itself.

We cannot conceive of a more efficient method of welding together the various nations of the world than through the perusal of such books. The terrible picture that is staring us in the face, of utter breakdown of civilization owing to our ignorance and wrong use of knowledge, can be effaced only by the acquisition of correct knowledge. The best means of achieving this

reference to the rapid progress of education in the country:— what sums were being spent on Primary, Secondary, Technical, Female and Higher Education, and what programme was under consideration in the Educational Policy of the Government. The paper—I was told later—conveyed a clear idea of general educational awakening in the State, to prominent Educationists of India, especially with reference to the great strides made during the reign of the present Nizam. This particular issue is still available from the Calcutta office of the Journal. Owing to its publication I omitted to dilate on these topics in my present address.

In comparison with the attention paid by Government towards the education of the country, the part played by the Public is a vanishing quantity. The best examples of public Educational enterprise in Hyderabad, comprised in the Jagirdar College, Mahbub College, Madrasa-i-Nizamiah, Mufeed-ul-Anam etc. depend for their success largely on the grant-in-aid paid by government. As a member of the Managing Committees of the Asafiah, Islamia Secunderabad, Aizza and other High Schools, I can speak from personal knowledge, of their satisfactory progress and assert that some of them are even going beyond their means in their efforts to serve the country. It is earnestly hoped that our leading aristocracy and wealthy magnates will take a deeper interest in the affairs of the aided schools and give tangible proofs of their benevolence by at least relieving these institutions of a portion of their liabilities incurred in the purchase of library books, furniture, science apparatus and game materials.

Adult education also has great importance in the scheme of education of modern civilized states. In my opinion the best means of solving this problem is to institute a number of suitable libraries in the length and breadth of the country, provided with a liberal supply of modern books of good cultural value, in addition to the usual routine of daily and weekly news-

be most advisable, therefore to train them generally for this occupation. But if special circumstances or natural propensities induce some of them to take up medicine, teaching, literature or even public service (as profession) with or without the idea of settled domestic life, they may be trained for these professions also, after making sure of their natural fitness and the consent of their parents or guardians. At all events, women, like men, should be given a general education up to a certain standard befitting the needs of citizenship and society, so that a fair standard of culture may be maintained in the community. No religion will be found averse to such an education, if the precepts of human morality and female modesty are duly adhered to.

Facilities should be provided for on a liberal scale to cater for the health and physical development of women students along with their intellectual training. Their schools should have ample play grounds and gardens to guarantee good health for the children of all grades of social standing.

The Role of Public Enterprise in Advancement of Education

Talking of the Educational problem of India I said a little time ago that I would endeavour to explain how the public can supplement the work of the State. I shall bring this address to a close with this discussion.

A perusal of the published Reports of the Government of Hyderabad, e. g. the Annual Administration Report etc. will show what large sums are spent by the State annually on public instruction and what schemes are under its consideration. In January 1937, when the Indian Science Congress Association was holding its annual meeting at Hyderabad. I wrote, at Prof. M. N. Saha's request, a short paper on Hyderabad, which was published in that month's issue of Science and Culture. The paper surveyed briefly the historical, geographical, fiscal and other administrative matters of the State, and bore a special

immolation of men on the altar of higher education, I am afraid we are tending towards a stage which will stagger us to see women give up their home-life and wander about with degrees and diplomas in courses evolved primarily (if not exclusively) for men. Experts in human evolution will then be shocked to realize what mental and moral effect this wrong system of training will have on the future of the human race.

I must not be taken to hold the view that women should be denied higher education. I rather assert that such girls as have evinced a special aptitude for fundamental subjects like languages, mathematics, science, history, geography, etc. while passing through the Primary and Secondary stages of Education, and turn towards the University for further training, should be granted every facility to attain to their highest goal of ambition in specialization. A glance at the lives of such gifted women as Madame Curie and Sonja Kowaleuski shows that there is no lack of candidates among women who can reach the topmost rungs of the ladder in subjects like physics and mathematics—generally assumed to be distasteful to the female sex—not to speak of chemistry, medicine, music and belles lettres etc., which are admittedly the subjects that appeal to them most through their personal tastes and natural bent of mind.

In spite of all this it is best to train them largely in subjects needed for a quiet domestic life, so that their future (married) life may not be embittered by lack of adequate training. On emerging from their Primary and Secondary stages of education they may be trained in subjects like domestic economy, needle-work, physiology, hygiene, nursing, child-psychology etc., and given degrees or diplomas, if they so desire.

Unless a cataclysmal disturbance upsets our normal mentality, or human society undergoes a radical change, domestic life would be the most cherished occupation for women. It would

Science. The German public has also instituted quite a large number of regular Societies whose aims and objects are to leave no German child physically weak or its health endangered through pecuniary incompetence of parents. Although the main-springs of this vigorous activity lie in the desire to prepare the country for an expected or coveted war, it needs no great insight to see what important influence this movement has in building up the national unity of the race and improving its general health and physique. It would be a capital idea if our countrymen also participate in a similar movement—not with the object of inter-communal fighting, but with an honest desire (and government sanction) to develop a healthy and robust physique in our nation.

Female Education and its ever-increasing Importance

Except in the countries of Islam during the days of its supremacy, rights approximating to equality with men could be extended to women only after years of efforts and struggle—and are still on their way to be extended. In the early stages of civilization, man, basing his judgment on the scheme of division of labour, then in vogue, indulged in assuming a greater importance to his mental powers and responsibilities; as a result of which it was considered proper to debar women, to a certain extent, from the benefits of Education.

By slow degrees, when it began to dawn on him that the average woman's brain is almost (if not quite) as efficient for receiving education as that of the average man; and education itself became accessible to larger numbers of people, woman also acquired gradually more and more facilities for getting educated. Such has also been the line on which female education progressed in India; and nowadays we find quite a big number of well-educated women in Travencore, Bengal, Madras and Bombay etc. Hyderabad too has accelerated its pace in this direction during recent years. But just as modern statesmen are alarmed at the

ability, not only welcome always the slight inconveniences caused by travel, they even go courting after them to a certain extent. If they do not rashly transgress the limits of discretion in their zeal for display of personal prowess and skill, and, voluntarily risking their lives, launch their relations and companions into trouble, it would be no exaggeration to say that such excursions constitute for students natural schools of ideal training. In the society of well-behaved companions and under the guidance of keenwitted leaders, they will learn to acquire habits of self-reliance, forbearance, economy, devotion to duty and enthusiasm of comradeship. We note with pleasure that many schools are nowadays organizing well-conducted educational tours and excursions.

In many schools in Europe and America moving pictures are requisitioned as an aid to education. They, by no means, illustrate erotic or objectionable stories. On the other hand, they convey to the student mind, in an artistic manner, vivid impressions of the latest discoveries of Science, of imposing terrestrial and celestial phenomena, and up-to date knowledge of industrial and economic characteristics of various countries. When they are used as an illustrated book to be carefully studied and pondered upon, the money spent on this rather expensive apparatus will be most efficiently employed. If they are used merely for amusement, it would be ever so much better to dispense with them altogether. The aphorism that there is no royal road to learning is as true in our own times as it was in the days of Plato and Aristotle.

Physical Training and Exercise.

Only a few months ago I read a short pamphlet entitled 'Physical Education in Germany' published by H. M Stationery office, London, from which I gather that the German government is spending large sums of money on the physical education of the German youth with as much zeal as on the cultivation of

through recreation. Recreation should be made an essential feature of child education, and such is actually done nowadays. It is being more and more increasingly adopted in the case of adults also. Kindergarten system has been in vogue in our country for a considerable time. When it was first introduced into the Madrsa-i-aliya, I was a pupil of that class. I still remember the fascination the school charts of Natural Phenomena and the Celestial Sphere had for me in those early days. What wonder that it was due to the secret, silent influence of these early impressions that I acquired later a deep interest in the various branches of Natural Science, and am still a keen watcher of celestial phenomena. I am sure this system is proving equally stimulating to others.

Quite recently (through Ward's Mineral Bulletins) I have come to know that American Boy Scouts, when out camping in the country, get instructions from their Senior comrades in the essentials of Geology and Mineralogy, advantage being taken of the environments they happen to be in at the time; and are encouraged to collect choice specimens of educational value. The same method, I understand, is being employed to acquire practical knowledge of Geography and History. It is hoped that our school boys also will make good use of such opportunities.

The Table-land of the Deccan is a veritable mine of Scientific problems awaiting investigation and solution. If students are encouraged to seek after them from a tender age, it is very likely that a number of curious phenomena and interesting observations will be presented before the Scientific world. I may be pardoned to mention that two of my papers on Geo-physics originated from participating in such recreative excursions.

It is difficult to cite a more potent means of stimulating research than travel. Ignoring those who imagine themselves to be made of wax or glass, students of average physical and mental

of answer-valuers to understand thoroughly the questions set for examination and to be able to solve them with great facility. When these people begin to receive piles of answer-books and are instructed to submit their results of valuation and detailed report within a prescribed time, they withdraw themselves from all other occupations and attend exclusively to this work. Each candidate has his peculiar mode of expression; his handwriting extends over the whole gamut of legibility and illegibility; on the top of all this, the examiner's sympathy varies from morning to evening (and day to day) with such internal and external factors as fitness of digestion and fairness of weather. Such being the case, except in certain branches of mathematics, uniformity in valuation of answers is difficult, even for the most experienced and conscientious examiner. That is why there is often such uncertainty in judging the proficiency of candidates by mere results of examination, and the certificates granted to several qualified persons stand in need of verification at every stage. In spite of all these facts, a simpler, speedier or more economical method of distinguishing the hall-marked educated from the non-educated has not as yet been evolved, and we can assert without fear of contradiction that the results adjudged by our own university examinations are at least correct to 75 P. C.

The most glaring defect in the examinations of our present universities lies in the attempt of examiners to find out what a candidate does not know, whereas in the more rational system of the west, stress is laid on ascertaining what the candidate actually knows and how far this knowledge is correct. If our universities were to adopt this policy, a larger number of pupils will profit by higher education and a vast body of students will escape the tortures of disappointment and despair at the critical stage of their development.

Recreation as an aid to education.

There can be no better way of imparting education than

An idea of our present state of helplessness may be formed from the fact that, after retiring from government service I applied myself heart and soul to work in Meteoric Astronomy and was rewarded by invitation not only to become member of Societies and Associations devoted to the study of this subject, but to take active part in an important International Observational Programme, for which a powerful comet-seeker was necessary. I regret to say that I failed to secure such a telescope anywhere in India and the price offered for one to be ordered from England was much above my dwindled means. When I approached some of our local wealthy magnates for sympathetic co-operation, they paid no attention to the matter, setting it down as an unprofitable hobby. Undeterred by such discouragement, I am still occupied with my favourite occupation; but it would have been ever so much better; if there had been some relief from pecuniary difficulties.

OUR EXAMINATIONS

While referring to the better systems of Education in foreign countries I drew attention to the more rational character of their examinations. I shall now try to analyse this rather vexed question. There is a hue and cry all over the world that examinations, especially university and competitive examinations for admission into service, demand an enormous amount of patience from their candidates and often exhaust all their energies. The results of examination are unconvincing (as a rule) to all except those who are fortunate enough to be declared successful. It is, of course, a natural consequence of human psychology to doubt the fairness of a test that disappoints men in their cherished objects. But we should try also to endeavour to realise the difficulties that face the examining bodies. As a rule, the questions set for an examination are framed by the same persons who are appointed to value their answers. Even if the two persons are different, there is no reason to doubt the capacity

men is still quite inadequate. At least four or five men of outstanding intellectual attainments should be trained in each subject who may be given enough pecuniary aid regularly till they are permanently provided for by appointment to decent salaried posts so that they may continue to pursue their investigations unhampered by financial difficulties and anxieties. No institution of higher education is entitled to respect if it does not turn out continuously research work of really high order, not merely in its own estimation, but according to the consensus of opinion of competent authorities. Such advanced investigations will obviously require costly equipment and apparatus. — Whatever money will be spent in this direction, will be well invested, if only such apparatus is purchased with the advice of real experts and the work of the institution is carefully scrutinized from time to time.

Need for Co-operation of wealthy Citizens.

On this occasion I wish particularly to draw the attention of that important class of wealthy citizens whose generous help can prove to be of utmost value to the country. During the Rule of H. E. H. the present Nizam, the State is spending money munificently on education, economical developments and works of public welfare; but it is sad to observe that, with a few notable exceptions, no activity is shown by the public in any of these concerns. I do not think there is a dearth of rich people in the State. We find here in addition to members of the aristocracy a large body of exceedingly wealthy capitalists and contractors who enjoy a life of great luxury and splendour. If these lucky people interest themselves in the educational needs of the country and try to walk in the footsteps of World's greatest benefactors, like Carnegie, Rockefeller, Alfred Nobel, Lord Nuffield and others, what wonder that a great impetus would be given to scientific research and other great activities, that may place Hyderabad in the front rank of progressive countries of the World.

places of honour in the estimation of their follow-workers in India. Most of them have been students of the Osmania University College at the time I was its principal. For the welfare of the country I can assert, on the basis of personal experience, that good scholars are mostly the products of careful encouragement and intellectual nourishment. The man entrusted with their "manufacture" should, of course, have adequate discernment to pick out competent candidates, capable of advanced intellectual development; should know what subjects they can really specialise in, and how far they can be left free to exercise their own faculties.

In identifying such promising young scholars I followed the suggestions of the poet Sa'adi, embodied in the following couplets which he apparently composed with a somewhat different object in view :—

- " At the departure of a caravan a man's young son got accidentally separated from him,
- " He searched after the boy during the night ;
- " Ransacked every camp and ran about in every direction.
- " At last in the darkness of the night he found the Light of his Eyes.
- " When he returned to his comrades in the caravan,
- " I heard him tell the camel driver.
- " Do you know how I managed to discover my dear child ?
- " Every one with whom I came up in my search, I imagined him to be my own son "

In the same spirit I regarded every student of my college as an earnest seeker after knowledge and deserving of stimulation and advancement. Those who did not really merit these compliments soon got eliminated and true genius was identified.

These scholars are now enjoying good appointments in various branches of State service and some of them are still engaged in useful research. In my opinion, however, the number of such

followed faithfully the instructions he was given. Reported stories undergo considerable modification from actual facts when passed from mouth to mouth and generation to generation; but, whoever has had the good fortune to be a pupil, in the real sense of the word, of a great Teacher in a European University, knows thoroughly well what a tremendous influence such men have on the mental and intellectual development of their students.

I have had a life-long connection with the Educational profession. All types of school and college students have happened to be my pupils. After years of experience I have come to the conclusion that a pupil who does not enjoy the kind attention of his master rarely wins success in the field of Learning. It is well-nigh impossible for him to soar to heights of fruitful Research unless and until his intellectual master or 'guru' accepts him as a loyal disciple or 'chela'. In the earlier stages of education, if a student fails to meet with the guidance of a conscientious teacher, a large period of his life is utterly wasted. Most students in India are weak in Mathematics, English and Science, really because they have had for teachers in their first stages of education men who have had no interest in the subjects they undertook to teach, and did not know what difficulties their poor students had in understanding these subjects, and how these difficulties could best be solved.

Need for more Research workers and Original Investigators in Hyderabad.

It is gratifying to note that Hyderabad has turned out some good scholars in the past few years. Since they were well cared for and awarded scholarships to prosecute higher studies in world's foremost seats of learning, they not only rose to positions of merit in their examination, they have kept themselves occupied with research work on return to Hyderabad and acquired

be opened in the Osmania University. Candidates graduating in this Faculty may be encouraged to qualify themselves fully for this pursuit by grant of lands on favourable terms, according to their hereditary connection with the profession, financial status and earnestness of enterprise.

Our University Students and Teachers

Commenting on the results of education in our Indian Universities, Indian critics themselves have often said that most of the students that enter our universities are unfit for them; that the main object of these students is to keep themselves engaged and get a University hall mark, in the hope of eventual success in securing a job in the clerical or teaching or some other similar line. As far as I can judge, this opinion is certainly correct to a large extent. But when we see that most of the unsuccessful candidates of our Indian Universities, when they migrate to Europe or America, do not return home without obtaining some degree or diploma of those foreign universities, we are compelled to admit that better education is available in foreign universities or, at least, their examinations are conducted on more rational lines. There is thus plenty of scope for reforming our Indian Universities and improving our system of Examination. Professors and Teachers of British Universities are undoubtedly abler and more conscientious than our own, barring some brilliant exceptions. Before we condemn our students as intrinsically unfit for higher education, we should try to rouse in our University teachers a greater enthusiasm for education and a desire to make their lectures more intelligible and attractive, to their pupils. There is an intimate relation between the pupils intellectual development and the Teacher's enthusiasm for teaching. A famous Cambridge coach is reputed to have said that, no matter what the academic standard of his pupil at the time of joining his classes, he would eventually pass out as a high class wrangler, if he

knowledge, however, this can be acquired through proper higher education and Research Laboratories. It would be advisable to appoint a Research Council either by Government or by the Industrial companies, in which experts in pure science and various branches of Industries and Agriculture may participate, as far as possible, solely for the welfare of the country and help with their valuable advice. Similar views have been expressed in the June number of Science and Culture:

To ascertain which of the indigenous industries are worth developing and where, perhaps the best plan would be to invite the opinions of competent touring officers in the Revenue and Educational departments and such other persons as are especially interested in these matters. On receipt of their opinions the State Commerce and Industries department may be consulted and a suitable commission appointed to tour in the districts and submit their report within a prescribed time. In accordance with the recommendations thus received, enterprising capitalists may be invited to float companies for establishing the industries specified. The State should also enter in these companies by either purchasing an adequate number of their shares or advance to them appropriate loans, so that a careful watch may be maintained on their working.

India failed to enter the field of industries with confidence and determination owing to her own belief that she was mainly (if not exclusively) an Agricultural country. Perhaps Mysore is the first State to break away from this traditional inferiority complex; and to put a bold step forward in this direction, Hyderabad should also turn its attention towards industrialization of the country as quickly as possible, so that future generations may be assured of reliable means of subsistence.

For the development of Agriculture I have already recommended in a former address that a Faculty of this subject should

While referring to industries it is painful to say that we are scared by the spectres of those heart-broken unfortunates, about to breathe their, last, who invested their modest earnings of life-long labour in the purchase of share-certificates of industrial companies, in the hope of serving their country by contributing to its industrial development and of gaining an honest source of income, fascinated by the glamour of high-sounding names of advertised directors; and who have been utterly ruined by the subsequent bankruptcy of these companies. If there can be any consolation at all for them, it is in the pious contemplation that their hard-earned money contributed to the benefit of the salaried employees of these companies all the time these bodies existed. In other words, only one ambition of the share holders viz, to serve their country could be realised and matters stopped at that.

Such is also the condition of the smaller banks which unfortunately are multiplying rapidly all over the country, and are ruining hundreds of innocent families. If Government will not attend speedily to these public nuisances and introduce measures to stop them through legislation etc., people will be as afraid of industries, commerce and banking as children are of bitter medicine.

Plans suggested to ensure success of Industries

A short time ago, I was asked, as a man of Science, by a well-know Indian industrial capitalist, whose sugar and other factories are working successfully in various parts of British India, as to what I considered most important for the success of indeginous industries, I at once told him that, in my opinion, honesty was the first and foremost factor, and next to it was correct technical knowledge. On hearing this he remarked that years of bitter experience had taught him exactly what I stated. In the present state of the world, it must be admitted that honesty can be inspired only through Divine Agency; as regards technical

Means suggested to promote Technical Education.

Schemes have recently been planned to check the increase of 'educated beggars' both in British India and in H. E. Hs' Dominions, and attempts are being made to carry them into effect. Though I do not belong to that body of lucky people whose opinions have been sought especially by our Educational department', yet I once called on the former D. P. I. and obtained from him a copy of the Government Report entitled 'The Reorganisation of Education'. As far as I could gather from this report the scheme appears to be appropriate to the occasion and it is quite likely that when it is put into practice, students who are really unfit for higher education would succeed in securing employment in Technical, commercial or Agricultural pursuits. I consider it necessary, however, to draw attention to certain matters in this connection. First of all, it should be borne in mind that Technical and Industrial works had been in full swing in Great Britain and other Industrial Countries of Europe and America before the opening of schools for teaching these subjects; and, as is evident from G. A. N. Loundes' recent little book 'The Silent Social Revolution', published by the Oxford University Press, not only are the youngsters working in industrial concerns taught systematically the basic principles of technology and allied subjects in these Technical Schools, every attempt is made also to impart Secondary and Cultural Education to grown-up people who get into service in industrial works immediately after their Primary Education to earn livelihood for themselves and their parents. At all events, it will be safe to assert that the benefits expected from Technical Education will be fully realized when industries will develop profusely in the state. It will obviously be a great mistake to postpone the opening of Technical Schools till that happy era dawns. These Technical Schools themselves may, in course of time, serve as an incentive to shrewd capitalists to found appropriate industries throughout the length and breadth of the country.

discoveries made by these masters, so that, wherever possible, the students themselves may, after completing their courses of study devote their talents and energies to widen still further the boundaries of knowledge. It must be remembered that a country where learned men of such advanced attainments are not turned out in adequate numbers is denied admission to the category of civilized nations, according to modern standards. At the same time, such centres of advanced learning are not necessarily recruiting grounds for candidates suitable for routine employments - if not positively unfit for them. Hence Educational departments must provide means for giving the rank and file of students an education that will qualify them for such routine services, in addition to catering for really advanced education for the more gifted candidates.

But if a country is so unfortunate as to offer no employments other than those of a clerical nature or its equivalent, if one were to put out of consideration the higher grades of service open only to a few lucky fellows or candidates winning success in competitive examinations and the lower grades of Army and Police services for which higher education brings no special reward, then it would not be fair to condemn higher education or those who strive to acquire it. The nature of the existing posts themselves may be judged to stand in need of remodelling. But without the intrinsic urge for such a change any such attempt will dislocate work in its present course. It is in such environments as these that the class of unfortunates comes into existence who are dubbed 'Learned Beggars' by some of our distinguished and prosperous statesmen. The name is probably meant to signify 'Educated Beggars' and not Learned Beggars, in the true sense of the appellation. The existence of Educated Beggars alone is an insult to civilization. A country where learned men come under the category of beggars would be the worst imaginable.

long experience, concerning the latest proposals about to be adopted by the Educational department of H.E.H. the Nizam's Government, as announced in their recently published reports. I assure all concerned that it is by no means my intention to criticise the Educational policies at present in vogue in British India or H. E. H's Dominions. How is it possible for a man whose advice was sought by the department for 30 years in practically all important matters of Education in Hyderabad and who had the unique opportunity of developing the most important institution of the Osmania University, in the days of its early evolution, to bring it to the highest standard of efficiency in India, to adopt a critical attitude under any circumstances. Above all, his self-restraint does not allow him to put forward any proposals, uncalled for. Whatever will be said on this occasion will be based on the fact that he is the representative of the Hyderabad Educational Conference — a body of distinguished Educationists and promoters of Education in the State. Whatever advice will be given, it will be in the hope that the department will take advantage of it and the country may escape the criticisms of its opponents. Moreover, as far as possible, every attempt will be made to impress on the public how it can co-operate with the government in its Educational policy and give it a helping hand.

Nowadays we hear constantly all over India that there are a great many educated men in the country, but few of them are fit for employment. From this we must infer that either their education is not good enough to qualify them for service, or the services are such that their duties cannot be discharged by educated men of the present generation. In any case, both the defects can be remedied, if the right attempt is made.

The real object of University education is to introduce students to the most advanced researches carried out by the great masters, and acquaint them with the most important

really represents the history of the human race ; to what extent published statements coincide with actual facts and how is it possible at all to have access to truth. Similarly, what difference there is between the Discoveries of Science and the Theories put forward for their explanation. The opinion prevailing among the uninitiated that Science actively undermines belief in God and aims at the destruction of all codes of morality is a downright falsehood. A recent statement made by Warburg in connection with the emission of rays from living matter, that "In Science one cannot prove there are no ghosts", should set public minds at ease as to what really is the aim and object of Science.

Need for proper training in Religion and Morals.

While Europe is laying stress on the importance of Biological Studies, to convince human beings of their common origin, I am of opinion that the same object may be easily acquired in Asia (especially India) by having recourse to proper Religious instruction. Scholars of all religions, if they really deserve to be called scholars, notice the same essential differences between good and evil, and identical principles of Ethics in all the religious teachings of the world. If we ignore the details of rites and rituals, all religions will be found to aim intrinsically at the unification of mankind, in general. It should be our duty to take advantage of these fundamental laws of Religion and its general teachings and try to eradicate from earth all racial dissensions and discords.

Present State of Education in India.

I think I have given enough time to touch upon the educational problems arising out of the present disturbed condition of the civilized world, and to suggest basic principles of solving them. I must now try to refer briefly to the present state of Educational institutions in India and their recent schemes of improvement. At the same time I would like to make a few, sincere suggestions, based on my

responsible for this state of affairs is glaring injustice. The real culprits are those who abuse these gifts of science. In the words of Sa'adi, "you were given an axe to chop wood, not to pull down the walls of a mosque." The terrible calamities inflicted by Italy on the poor and unarmed peoples of Abyssinia and other countries through poison-gas and explosive bombs, the burden under which progressive nations are groaning to meet the heavy expenses of manufacturing munitions and war-materials and the agonizing restlessness of civil populations under constant fear of sudden and unprovoked attacks from their neighbourly nations, are features of modern civilization that need no comment.

The only way to save the civilized world from this threatening universal catastrophe is by adopting a reformed and rational system of education. Just as a judicious consciousness of nationality is an important factor in the development of civilization its undue obsession is highly detrimental. If human beings are appropriately instructed in the teachings and counsels of the great thinkers of the East, while still in their impressionable age, it is possible to reconstruct the world on a basis of peace and universal satisfaction. What arguments can be more convincing than those embodied in the following couplets:-

"Human beings are to one another as the limbs of one
and the same body;

"As they have been created from a common origin.

"When one limb happens to suffer from some disorder,

"All the others cease to enjoy rest."

In their attempt to save the world from this catastrophe a growing circle of scientists and broad-minded statesmen of various countries recommend a course of liberal education in which Biology occupies a prominent place, so that students may know where man comes in, in the general scheme of Life, and what is the true meaning of Evolution; how the development of various nations has been affected (for good or evil) by geographical conditions; how far the branch of knowledge generally called History

may appropriately be called cousins from the same family stock); and it was this same lesson that enabled man to acquire the main attributes of humanity. But unfortunately, these feelings of sympathy and amicability continued to form an integral part of man's character only as long as he quailed before the severity of cyclic and seasonal disturbances, and was unable to repair with alacrity the damages caused by the ravages of thunder and lightning, earthquakes and pestilential diseases. Now that he has to a certain extent acquainted himself with the apparent causes of these externally imposed calamities and can, at least, control them to the extent of preventing them from interfering with his worldly occupations—if not completely overcoming them, he has commenced to abandon the virtues he acquired even in his pre-natal stage, and, having overcome dead matter and the lower animals, launched forth on the expedition of conquering his fellow beings—in other words, set out to commit suicide '*en-masse*'.

Material Progress in the West with the Advance of Science.

There is no doubt that the present material progress of Western countries is due to their scientific achievements. Scientists in their pure and unselfish search for truth, unbiassed by the general trend of the world and its prejudices, published their epoch-making discoveries.

Another batch of investigators making use of these discoveries, invented instruments and machinery compounds and contrivances of ever increasing power and applicability, mainly with a desire to support good and counteract evil; but, it is sad to observe, powerful and wealthy nations with warlike propensities utilized these inventions for quite different purposes, thus Jeopardizing the peace of the world. Armaments began to heap up, ostensibly in the name of self-defence, and objects which otherwise would have been deemed the most beautiful products of investigations and research, became the instruments of wholesale murder and devastation! To hold science or its votaries

It is greatly to be feared that in some parts of India this dangerous system of education may lay its hold on the public mind. Great Britain with her colonies and the American continent, however, are yet immune from its poisonous effects.

No one can afford to live a life of peace and satisfaction while this terrible picture of the present generation looms large before us. The most ironical feature about this state of affairs is that every incident associated with it is regarded as a consequence of civilization itself. We should therefore be on our guard and avoid blindly adopting methods of education and civic life at present in vogue in Russia, Germany and Italy, under the lure of their apparent material progress.

The correct aim of education is to contribute towards the mental, physical, intellectual and moral evolution of man. Nature herself has inspired us with education, and in accordance with her primeval policy, having sown the seed of education in our hearts, simultaneously with our coming into existence, also expects us to nurture this seed with the help of our senses and intellect and reap the benefits of its development. Biological research points out that it was by following this process that man not only achieved supremacy over other animals, but having gradually acquired knowledge of the laws of nature, determined to conquer everything around him. In reality this very effort and endeavour on his part guided him on to civilization and progress. But unfortunately the victories he continually won over dead matter and the lower animals intoxicated him to such an extent that he forgot the very meaning of civilization, which he had learnt after thousands of years of toilsome experience.

It was a lesson taught by nature herself that the human species contrived to separate into isolated groups of nations, in accordance with local and temporary distinctions, to live a life of complete harmony among its own members and of sympathy and amicability with members of other groups (which

Translation of
Presidential Address
Read at the Eleventh Meeting
of The Hyderabad Educational Conference,
at the Town Hall, HYDERABAD - Deccan
On 18th August 1938,
By MOHD. A. R. KHAN, F. R. A. S.

A Glance at Education in Modern Civilized Countries

In the present epoch, I regret to say, all the affairs of the world are becoming highly complicated. During the past fifty years Western nations have obtained control over fire, air, water and earth so rapidly and, with the aid of science, achieved such signal success in providing ways and means for their comfort, that an influential clique among them began in its pride, to ignore the very first principles of humanity. After getting access to some secrets of Nature this clique lost sight of even the very origin of the human race. Forbearance, kindness, sympathy and fellow-feeling, which form the essential characteristics of even animals in the higher grade of evolution, and which constitute the main factors in the elevation of man from the category of wild beasts to his present exalted position, came to be regarded as symptoms of weakness. Religion was considered to be synonymous with superstition; Social and moral rules and regulations were subordinated to convenience and utility; a gulf as wide as that between heaven and earth was thrust in to differentiate between one's own people and aliens; and in such environments mentality was subjugated and a pure and holy process like education began to be employed as a means of propaganda for moulding peculiar types of mentality.

After the downfall of Czarist Russia, other countries like Germany, Italy etc, impressed by its material advantages, adopted the process with modifications to suit their own requirements.

ERRATA

Page	Line				
		27—	for	"thing"	read "think"
"	9	26—	"	"indeginous"	"indigenous"
"	10	9—	"	"indeginous"	"indigenous"
"	10	16—	"	"accordence"	"accordance"
"	13	7—	"	"adeqate"	"adequate"
"	30	33—	"	"irreconciliable"	"irreconcilable"
"	32	3—	"	"fundemental"	"fundamental"
"	33	3—	"	"permanance"	"permanence"
"	33	21—	"	"indispensible"	"indispensable"
"	35	22—	"	"nation"	"notion"
"	38	29—	"	"it"	"its"
"	41	16—	"	"He-gel"	"Hegel"
"	42	1—	"	"gentleman"	"gentlemen"
"	42	2—	"	"afforded"	"accorded"
"	42	10—	"	"visciated"	"vitiated"
"	42	14—	"	"fascilitate"	"facilitate"
"	42	31—	"	"accomodate"	"accommodate"
"	43	2—	"	"entir"	"entire"
"	43	9—	"	"condusive"	"conducive"
"	43	23—	"	"lavatries"	"lavatories"
"	43	23—	"	"wors"	"worst"
"	43	27—	"	"carring"	"carrying"
"	43	31—	"	"accomodated"	"accommodated"
"	44	2—	"	"extrem"	"extreme"
"	44	2—	"	"viciated"	"vitiated"
"	44	8—	"	"stoney"	"stony"
"	44	26—	"	"for fieted"	"forfeited"
"	44	30—	"	"Hyginecally"	"hygienically"
"	44	34—	"	"Sympathic"	"Sympathetic"
"	45	11—	"	"state"	"State"
"	45	12—	"	"1st"	"first"
"	48	21—	"	"practitoner"	"practitioner"
"	48	26—	"	"socialogical"	"sociological"
"	49	1—	"	"year"	"years"
"	51	33—	"	"advance"	"advanced"
"	52	32—	"	"heriditary"	"hereditary"
"	53	2—	"	"overhelm"	"overwhelm"
"	53	8—	"	"eduaation"	"educational"

مَطْبُوعَہ

مکتبہ ابراہیمیشین پریس سٹیشن روڈ ممبئی

حیدر آباد دکن

791543.4

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No.

Accession No.

Author

52151

Title .

This book should be returned on or before the date
last marked below.

۱۔ اگر کسی نے عین حق پر عمل کیا ہے تو اس کا جہنم میں جانا ضرور ہے۔
 ۲۔ اگر کسی نے جہنم میں جانا چاہا ہے تو اس کا جہنم میں جانا ضرور ہے۔
 ۳۔ اگر کسی نے جہنم میں جانا چاہا ہے تو اس کا جہنم میں جانا ضرور ہے۔
 ۴۔ اگر کسی نے جہنم میں جانا چاہا ہے تو اس کا جہنم میں جانا ضرور ہے۔
 ۵۔ اگر کسی نے جہنم میں جانا چاہا ہے تو اس کا جہنم میں جانا ضرور ہے۔
 ۶۔ اگر کسی نے جہنم میں جانا چاہا ہے تو اس کا جہنم میں جانا ضرور ہے۔
 ۷۔ اگر کسی نے جہنم میں جانا چاہا ہے تو اس کا جہنم میں جانا ضرور ہے۔
 ۸۔ اگر کسی نے جہنم میں جانا چاہا ہے تو اس کا جہنم میں جانا ضرور ہے۔
 ۹۔ اگر کسی نے جہنم میں جانا چاہا ہے تو اس کا جہنم میں جانا ضرور ہے۔
 ۱۰۔ اگر کسی نے جہنم میں جانا چاہا ہے تو اس کا جہنم میں جانا ضرور ہے۔

